بینظیر کہانی
عباس اطہر
Reproduced in PDF
By
Sani Hussain Panhwar
Member Sindh Council, PPP
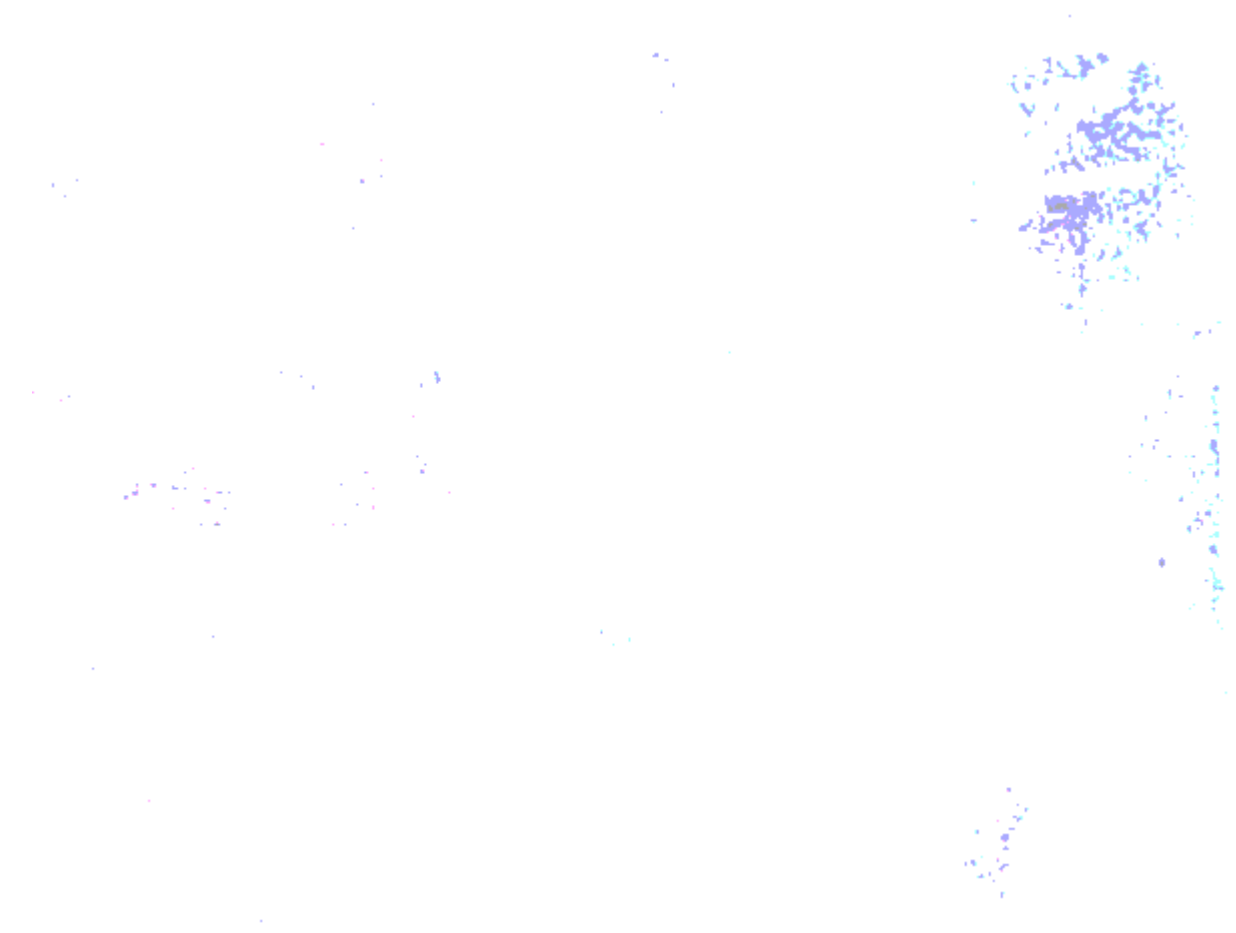
شاعر، صحافی، کالم نگار اور اینکر پرسن عباس اطہر 12 اپریل 1939ء کو تاج پورہ گاؤں نزد غازی آباد، مغل پورہ لاہور میں پیدا ہوئے۔ 1964ء میں ان کی نظموں کا پہلا مجموعہ ''دن چڑھے دریا چڑھے'' شائع ہوا۔ اسی سال روزنامہ انجام کراچی کے ذریعے صحافت کی دنیا میں قدم رکھا۔ ''روزنامہ امروز'' سے وابستہ ہو کر لاہور آ گئے۔ یونین لیڈری کی پاداش میں برطرف ہوئے۔ پھر روزنامہ ''آزاد'' اور ''مساوات'' میں اخباری سرخیوں کی نئی طرح ڈالی۔ ضیاء الحق کے دور میں شاہی قلعہ اور جیل کاٹی۔ اس قید میں 3 اور 4 اپریل 1979ء کی درمیانی رات بھی شامل ہے جس میں ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دی گئی۔ 1981ء میں ملک چھوڑ دیا۔ امریکہ میں 8 سالہ جلاوطنی کاٹنے کے بعد وطن واپس آ کر روزنامہ ''نوائے وقت'' سے صحافت کے دوسرے دور کا آغاز کیا جو دو وقفوں میں گیارہ سے بارہ سال پر مشتمل تھا۔ روزنامہ ''پاکستان'' اور روزنامہ ''صحافت'' کے ایڈیٹر رہے۔ باقاعدہ کالم نویسی روزنامہ ''خبریں'' سے 1997ء میں شروع کی۔ 2006ء میں ''روزنامہ ایکسپریس'' کے گروپ ایڈیٹر بنے۔ ''ایکسپریس نیوز'' کے ٹاک شو ''کالم کار'' میں میزبانی کے فرائض بھی انجام دیتے ہیں۔

سرورق تصاویر:

(دائیں): 28 دسمبر 2007ء آصف زرداری اور بلاول بھٹو زرداری محترمہ بینظیر بھٹو شہید کی قبر پر پھول چڑھا رہے ہیں۔

(بائیں): 4 اپریل 1979ء یہ ذوالفقار علی بھٹو کا جنازہ ہے جنہیں راولپنڈی جیل میں سزائے موت دی گئی پھر رات کے اندھیرے میں فوج کے پہرے میں میت گڑھی خدا بخش پہنچائی گئی۔ چند اہل خانہ کو بند تابوت میں چہرے کا آخری دیدار کرایا گیا۔ ایک پرانی چارپائی پر تابوت رکھ کر جنازہ گڑھی خدا بخش کے قبرستان میں لایا گیا۔ اِدھر اُدھر کے کچھ لوگ اکٹھے کر کے نماز جنازہ پڑھائی گئی۔ خاندان کے کسی اہم فرد کو شریک نہیں ہونے دیا گیا۔ کسمپرسی کے اسی عالم میں انہیں قبر میں اتار کر وہاں پہرہ لگا دیا گیا جو کئی ماہ کے بعد اٹھا۔

عباس اطہر

کامران پبلشرز

انتساب

اپنے بیٹے شاویز اور بیٹی مسکان کے نام

فہرست

حرف آغاز

''اپنا اپنا سچ''

یہ کہانی پاکستان ٹوٹنے کے بعد شروع ہوئی تھی۔ 16 دسمبر 1971ء کو ڈھاکہ کے پلٹن میدان میں پاکستانی فوج نے جنرل امیر عبداللہ خان نیازی کی کمان میں بھارتی فوج کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔ بھارت فوجیوں سمیت 90 ہزار پاکستانیوں کو جنگی قیدی بنا کر کلکتہ کے کیمپوں میں لے گیا۔ ان دنوں ذوالفقار علی بھٹو اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں پاکستان کی نمائندگی کر رہے تھے۔ سلامتی کونسل جنگ بندی کی قرارداد کو سوچے سمجھے منصوبے کے تحت موخر کرتی رہی۔ 15 دسمبر کو بھٹو سلامتی کونسل کے اجلاس میں پھٹ پڑے۔ انہوں نے کہا کہ ''پچھلے چار دنوں سے یہ کونسل تاخیری حربے استعمال کر رہی ہے۔ اب ہم وہاں پہنچ چکے ہیں جہاں ہمیں تمہاری کوئی پروا نہیں۔ میں شکست کی دستاویز پر دستخط نہیں کروں گا۔ تم پورے مشرقی پاکستان پر قبضہ کرالو، ڈھاکہ پر قابض ہو جاؤ، مغربی پاکستان پر تسلط قائم کرلو، تم کوئی تصفیہ نہیں چاہتے، ہمیں توپوں اور اسلحہ کے زور پر خاموش کرنا چاہتے ہو، تم جارحیت کو جائز قرار دینا چاہتے ہو، ناجائز قبضے کو قانونی حیثیت دینے کے خواہشمند ہو، تم ہر اس عمل کو جائز قرار دینا چاہتے ہو جسے آج تک ہمیشہ ناجائز سمجھا گیا۔ ہم لڑیں گے، ہم نیا اور عظیم تر پاکستان بنائیں گے۔ یہاں بیٹھنا میری ذات اور میرے ملک کی توہین ہے، میں بائیکاٹ نہیں کر رہا لیکن ادھر بیٹھ کر ایک منٹ بھی ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ میرا ملک مجھے بلا رہا ہے۔ میں جا رہا ہوں''۔ انہوں نے اپنے سامنے پڑے ہوئے کاغذات پھاڑ کر فرش پر پھینک دیئے، کرسی

سے اٹھے اور اجلاس سے باہر نکل آئے۔ یہ واقعہ یو ٹیوب پر موجود ہے۔ جس کو ابھی تک یہ علم نہیں کہ ''بھٹو کون تھا'' اُسے ضرور دیکھنا چاہیے۔ وہ تاریخ کا ایک ایسا سچ تھا جو کبھی نہیں مرتا اور جسے کبھی جھوٹ کے اندھیروں میں گم نہیں کیا جا سکتا۔

پاکستان واپسی سے پہلے انہوں نے صدر نکسن سے ملاقات کی۔ اس وقت اندرا گاندھی مغربی پاکستان پر فیصلہ کن وار پر تلی ہوئی تھیں۔ بھٹو صاحب نے نکسن کو علاقے کی اہمیت اور معاملے کی سنگینی سمجھائی۔ امریکہ نے مغربی پاکستان کو بچانے کیلئے اپنا بحری بیڑہ پاکستان روانہ کیا۔ اس سلسلے میں صدر نکسن نے اپنی کتاب میں لکھا تھا کہ میں نے اپنے وزیر خارجہ کے ذریعے بھارتی سفیر کو پیغام بھجوایا کہ وہ اپنی وزیراعظم کو بتا دیں کہ اگر مغربی پاکستان پر پیش قدمی فوری طور پر نہ روکی گئی تو امریکہ بھارت کے خلاف انتہائی اقدام کرنے سے بھی گریز نہیں کرے گا۔

پاکستان کی نئی کہانی کا آغاز 20 دسمبر 1971ء کو اس طرح ہوا کہ جنرلوں نے یحیٰی خان کو زبردستی رخصت کر کے ذوالفقار علی بھٹو کو سویلین چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر اور صدر بنا کر ملک کو شکست کی تباہی و بربادی اور تذلیل سے نکالنے کا چیلنج سونپا۔ بھٹو صاحب نے عسکری اور اقتصادی کھنڈرات پر نئے محلات تعمیر کئے۔ ملک کو متفقہ آئین اور جمہوریت دی۔ جنگ کے نقصانات کا ازالہ کیا۔ مسلمان ملکوں کے ساتھ نئے رشتے بنائے، ایک لبرل پاکستان ترقی اور خوشحالی کے سفر پر تیز رفتاری سے گامزن تھا کہ 4 جولائی 1977ء کو جنرل ضیاء الحق نے بھٹو حکومت پر شب خون مارا۔ پہلے حملے میں آئین اور جمہوریت دونوں کو قتل کر ڈالا اور دوسرے حملے میں 4 اپریل 1979ء کو ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دے دی۔ جنرل ضیا اور دائیں بازو کی جماعتوں کا خیال تھا کہ بھٹو کی کہانی ختم ہو گئی ہے۔ انہیں اندازہ نہیں تھا کہ یہ کہانی بھٹو صاحب کی ذات تک محدود نہیں تھی بلکہ محروم طبقوں کے دلوں پر بھی نقش تھی۔ بھٹو کو بچانے کیلئے ہزاروں افراد نے جیلیں بھگتیں، کوڑے کھائے، عقوبت خانے کاٹے، خود سوزیاں کیں لیکن نہتے عوام فوج سے نہیں لڑ سکتے تھے اس لئے ہار مان کر اپنے گھروں میں

بیٹھ گئے۔ ان کے پاس واحد ہتھیار اپنا اپنا ووٹ تھا۔ انہوں نے ووٹ کی پرچیاں اپنی مٹھیوں میں بند کر لیں تاکہ جب کبھی عام انتخابات ہوں، بھٹو صاحب کا قرض چکا سکیں۔ ان غریب اور کمزور طبقوں نے ''بھٹوازم'' کو اپنا عقیدہ بنا لیا جسے وہ نجات کا راستہ سمجھتے تھے اور یہی وہ عقیدہ ہے جو آج بھی زندہ ہے۔

بھٹو صاحب کو خاصی حد تک یقین تھا کہ جنرل ضیاء الحق انہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ جب بھی بیگم نصرت بھٹو اور بینظیر ان سے ملاقات کیلئے جیل جاتیں، بیگم صاحبہ الگ بیٹھی رہتیں، وہ بینظیر کو اپنے نہایت قریب بٹھاتے اور باپ بیٹی ایک دوسرے کے کان میں سرگوشیاں کرتے رہتے۔ پھانسی کی کوٹھری ''بگ'' کی جاتی تھی۔ ایک ایک بات سنی اور ریکارڈ ہوتی تھی لیکن سرگوشیوں میں جو بھی باتیں ہوئیں، ہلکی سی بھنبھناہٹ کے سوا کچھ ریکارڈ نہیں ہو سکا۔ اس حکمت عملی سے بھٹو صاحب نے یقیناً اپنی بیٹی کو زندگی اور سیاست کے وہ تمام راز بتائے اور اپنی موت کے بعد کا لائحہ عمل سمجھایا ہوگا اور اپنے ایک ایک ساتھی کے بارے میں یہ رائے دی ہوگی کہ وہ کس قدر قابل اعتبار ہے اور اس پر کتنا انحصار کیا جا سکتا ہے اور وہ کس حد تک دھوکہ دے سکتا ہے۔

4 اپریل 1979ء کو جب بھٹو صاحب کو پھانسی دی گئی تو محترمہ کی عمر صرف 24 سال تھی۔ اس وقت تک انہوں نے ایک شاندار زندگی گزاری جس میں دکھوں اور مصیبتوں کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ بہرحال انہوں نے اپنے والد کی گرفتاری کے بعد فوج، پولیس اور جسٹس مولوی مشتاق حسین کے ہاتھوں انہیں تذلیل کا نشانہ بنتے اور پھر راولپنڈی جیل کی پھانسی کی کوٹھری میں بدترین حالات کا مقابلہ کرتے دیکھا۔ محترمہ کے دکھوں کی شروعات یہیں سے ہوتی ہے۔ انہیں سیاست کا عملی تجربہ تھا نہ پارٹی کے لیڈروں اور کارکنوں سے شناسائی تھی۔ اس کے باوجود بھٹو صاحب نے ان کی سالگرہ پر جیل سے لکھے گئے اپنے آخری خط میں انہیں اس جنگ کی قیادت سونپ دی جو ان کے قتل کے بعد شروع ہونی تھی۔ اس خط کا ایک پیرا گراف ملاحظہ ہو:۔

''زندگی محبت کا ملہ ہے۔ نیچر کی ہر خوبصورتی کے ساتھ اظہار عشق کیا جاتا ہے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی پس و پیش نہیں ہے کہ میرا سب سے زیادہ جذباتی عشق اور جذبات کو تیز یا جسم میں جھرجھری پیدا کر دینے والا رومانس عوام کے ساتھ رہا ہے۔ سیاست اور عوام کے درمیان کبھی نہ ختم ہونے والی شادی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ''آدمی ایک سیاسی جانور'' ہے اور ریاست یا مملکت ایک سیاسی تھیٹر ہے، میں بیس سال سے زائد ہنگامہ خیز سالوں سے سٹیج پر رہا ہوں اور یقین رکھتا ہوں کہ مجھے اب بھی کوئی رول ادا کرنا ہے۔ لوگ اب بھی چاہتے ہیں کہ میں سیاست کے سٹیج پر موجود رہوں۔ لیکن اگر مجبوراً مجھے اس سٹیج سے علیحدہ ہونا پڑا تو میں تمہیں اپنے احساسات کا تحفہ دیتا ہوں۔ میرے مقابلہ میں تم زیادہ بہتر طور پر یہ جنگ لڑ سکو گی۔ تمہاری تقاریر میری تقاریر کے مقابلہ میں زیادہ فصیح و بلیغ ہوں گی۔ عوام کے ساتھ تمہاری وابستگی مکمل ہوگی۔ تمہاری جدوجہد میں زیادہ توانائی اور جوانی کا جوش ہوگا۔ تمہارے اقدامات زیادہ جرات مندانہ ہوں گے۔ میں اس انتہائی مقدس مشن کی برکتیں تمہیں منتقل کرتا ہوں۔ صرف یہی تحفہ میں تمہیں تمہاری پیدائش کی سالگرہ پر دے سکتا ہوں''۔

4 اپریل 1979ء کے بعد ذوالفقار علی بھٹو کی وہ ''بینظیر کہانی'' شروع ہوئی جس کا عنوان ''بھٹوازم'' ہے، جس کے نعرے ''کل بھی بھٹو زندہ تھا، آج بھی بھٹو زندہ ہے، جب تک سورج چاند رہے گا، بھٹو تیرا نام رہے گا'' ہیں۔ بینظیر اپنی والدہ بیگم نصرت کے ساتھ میدان جنگ میں اتریں، پہلے مرحلے میں انتخابی مہم میں حصہ لیا۔ عوام کے ہجوم دیکھ کر جنرل ضیاء الحق نے یہ انتخابات ملتوی کر دیئے تھے۔ بینظیر صاحبہ نے مختلف شہروں کے دورے شروع کئے اور پارٹی لیڈروں اور کارکنوں کا حوصلہ بڑھایا۔ ضیاء حکومت سے یہ سرگرمیاں برداشت نہیں ہو سکیں۔ دونوں ماں بیٹی کو نظر بند کر دیا گیا۔ محترمہ نے ضیاء حکومت کے خلاف اپنی جنگ جاری رکھی جس پر انہیں ملک کے بدترین عقوبت خانے، مچھ جیل میں بھی قید رکھا گیا۔ بڑھتے ہوئے ظلم اور زیادتیوں سے تنگ آ کر بیگم نصرت بھٹو کے بعد انہیں بھی جلاوطنی اختیار کرنا پڑی۔ لندن میں بیٹھ کر انہوں نے پاکستان میں پارٹی کو بھی متحد رکھا لیکن اپنی جنگ جاری رکھی،

بین الاقوامی شناخت بنائی اور اسے اپنی سیاسی حکمت عملی کا حصہ بنالیا۔ 10 اپریل 1986ء کو جب وہ واشنگٹن اور سعودی عرب سے ہوتی ہوئی لاہور پہنچیں تو ان کا استقبال اتنا بڑا تھا کہ آج تک اس کی مثال دی جاتی ہے۔ محترمہ کو بھٹو صاحب کے ورثے میں بے پناہ عوامی حمایت کے ساتھ اسٹیبلشمنٹ کی بدترین ''دشمنی'' بھی ملی تھی۔ جنرل ضیاء کی موت کے بعد ان کے بھوت ان کے پیچھے لگے۔ سازشوں، بدنامیوں، بہتان تراشیوں اور جھوٹے مقدمات کے طوفان کے باوجود انہوں نے دو بار حکومت جیتی۔ 1977ء کے مارشل لا کے بعد پیپلز پارٹی کے کارکنوں کو مسلسل ظلم کا نشانہ بنایا گیا۔ اُن کے روزگار چھینے گئے اور کاروبار تباہ ہوئے۔ نئی ملازمتیں تک نہیں دی گئیں اس کے باوجود اس کا ووٹ بنک جس نے 1970ء میں پولنگ سٹیشنوں پر نمودار ہو کر مغربی پاکستان میں بھٹو کو نا قابل یقین کامیابی دلوائی تھی، ہر الیکشن میں ثابت قدم رہا اور فروری 2008ء کے انتخابات میں محترمہ بینظیر کے قتل کے باوجود بھٹو ازم کے نئے وارث آصف علی زرداری پر نچھاور ہوا۔ دنیا میں شاید کہیں بھی کوئی ایسی مثال موجود نہ ہو کہ کسی سیاسی قیادت کا ووٹ بینک پھانسی کے پھندوں سے لٹکا ہو۔ تختوں، قتل گاہوں میں ذبح ہوا ہو، عقوبت خانوں اور جیلوں میں سڑتا رہا ہو پھر بھی زندہ رہا ہو۔ 41 سال گزر گئے، ایک نسل رخصت ہوگئی۔ اس کے باوجود اس ''بینظیر کہانی'' کا تسلسل نہیں ٹوٹا۔ بھٹوز کی وہ ''بینظیر کہانی'' نہ صرف آصف علی زرداری تک پہنچی بلکہ اس نے اُن کی زندگیوں کو بھی اپنے اندر سمیٹ لیا۔ یہ کہانی موت اور ظلم کے مقابلے میں مصیبت، مزاحمت اور شجاعت سے عبارت ہے۔ یہ کہانی اتنی بے رحم ہے کہ جس ذوالفقار علی بھٹو نے اس پاکستان کو دوبارہ زندگی دی۔ جس نے ایک ہاری ہوئی فوج کو پہلے سے زیادہ طاقتور بنایا، اُسی فوج نے اُسے پھانسی چڑھا دیا۔ محترمہ نے 24 سال کی عمر میں سیاسی جنگ شروع کی تھی اور اسے تیس سال تک جاری رکھا۔ مختلف معرکوں میں زخموں سے چور ہونے کے بعد بار بار اپنے پاؤں پر کھڑی ہوئیں اور از سرِ نو صف بندی کر دی اور آخری جنگ میں بھٹو صاحب کے پھانسی گھاٹ سے کچھ فاصلے پر لیاقت باغ راولپنڈی کے میدان جنگ میں لڑتی ہوئی شہید ہوگئیں۔

ان جنگوں میں عوام کی سپاہ کے ساتھ ساتھ جس طاقت نے فیصلہ کن کردار ادا کیا، وہ اُن کے شوہر آصف علی زرداری ہیں۔ زرداری صاحب کو سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ''ولن'' بنایا گیا۔ ہر بدنامی اُن کے نام سے منسوب کی گئی۔ انہوں نے دو قسطوں میں گیارہ سال جیل کاٹی۔ لیکن وہ جب کبھی عدالتوں میں حاضر ہوتے تھے، مسکراتے رہتے اور اس طرح کا تاثر دیتے تھے جیسے معمول کی زندگی گزار رہے ہوں۔ جوانی کے گیارہ سال انہوں نے اُس جنگ کی نذر کر دیئے جو محترمہ بینظیر باہر رہ کر لڑ رہی تھیں۔ انہوں نے اپنی اولاد کے بچپن کا وہ زمانہ بھی نہیں دیکھا جب اُن کی معصومانہ حرکتیں والدین کی زندگی کا سب سے خوبصورت نظارہ ہوتی ہیں۔ آصف زرداری ایک لمحے کے لئے بھی ڈگمگا جاتے تو محترمہ متذبذب ہو جاتیں۔ انہوں نے رہائی کی خواہش تو کیا کبھی ایسا اشارہ بھی نہیں دیا کہ محترمہ اپنی سیاست پر سودے بازی کر کے انہیں آزادی دلوا دیں۔ محترمہ بینظیر اور آصف زرداری کے دکھوں اور محرومیوں کو اس لیے اہمیت نہیں دی جاتی کہ وہ جنگجو تھے اور مظلوم طبقوں کیلیئے وہ لڑائی لڑ رہے تھے جو بھٹو صاحب نے اپنی بیٹی کو سالگرہ کے تحفے کے طور پر دی تھی۔

محترمہ کے بعد پیپلز پارٹی نے جو بھی سیاسی کامیابیاں حاصل کیں وہ زرداری صاحب کی حکمت عملی کا نتیجہ ہیں۔ جن حالات میں وہ یہ سیٹ اپ چلا رہے ہیں، اُسے ایک معجزہ ہی کہا جا سکتا ہے۔

ذوالفقار علی بھٹو سے شروع ہونے والی یہ ''بینظیر کہانی'' جاری ہے اور اُس وقت تک جاری رہے گی جب تک محروم طبقوں کی اُمیدیں زندہ ہیں اور پیپلز پارٹی کے ساتھ وابستہ ہیں اور جب تک بھٹو کے وارثوں کا یہ عقیدہ قائم ہے کہ

یہ بازی جان کی بازی ہے
ہم جیتیں گے تم ہارو گے
ہر گھر سے بھٹو نکلے گا
تم کتنے بھٹو مارو گے

''بینظیر کہانی'' دنیا کی سیاست میں اپنی نوعیت کا سب سے بڑا المیہ ہے۔ ذوالفقار علی بھٹو کا خاندان 6 افراد پر مشتمل تھا۔ دو میاں بیوی، دو بیٹے اور دو بیٹیاں۔ اس خاندان کے سربراہ کو 51 سال کی عمر میں پھانسی دے دی گئی، چھوٹا بیٹا 27 سالہ شاہنواز بھٹو فرانس میں پراسرار طور پر مارا گیا۔ مرتضٰی بھٹو کو 42 سال کی عمر میں کسی نامعلوم کمین گاہ سے گولیاں مار کر کراچی میں اس وقت قتل کر دیا گیا جب محترمہ بینظیر بھٹو وزیراعظم تھیں اور چاروں طرف سے سازشوں میں گھری ہوئی تھیں۔ بینظیر صاحبہ کی عمر 54 سال تھی جب لیاقت باغ راولپنڈی میں ان کا خون کیا گیا۔ بھٹو کی سب سے چھوٹی صاحبزادی صنم بھٹو اس لئے زندہ ہیں کہ وہ سیاست سے لاتعلق ہو کر مستقل طور پر برطانیہ میں بس گئی تھیں۔ بیگم نصرت بھٹو دبئی میں ہیں۔ مرتضٰی بھٹو کی موت کے صدمے کے بعد وہ دنیا کیلئے، دنیا ان کیلئے مر گئی۔ وہ یہ بھی نہیں جانتیں کہ وہ کون ہیں کیا تھیں اور اب کیا ہیں۔ این آر او کا فیصلہ آنے کے بعد ان کے خلاف ایک مقدمہ سرکار بنام بیگم بھٹو کھولا گیا تھا۔ عدالت نے انہیں حاضر کرنے کا حکم بھی جاری کیا تھا۔ پھر رحم کھا کر مستثنٰی قرار دے دیا۔ بھٹو صاحب اور ان کے خاندان پر، جو کچھ بیتی، اسے اتفاقات کے زمرے میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ایک سوچا سمجھا انتقام تھا۔ اس سوچ کا جو بھٹو صاحب نے غریب اور مظلوم طبقوں میں پھیلائی کہ وہ نہتے اور بے بس نہیں ہیں۔ وہ اپنے ووٹ کی پرچی کو برچھی بنا کر اپنے لئے نئی دنیائیں فتح کر سکتے ہیں۔

''سٹیٹس کو'' کی علمبردار مسلح طاقتوں اور نہتی پیپلز پارٹی کے درمیان یہ ''جنگ'' 1967ء میں اس وقت شروع ہوئی جب ذوالفقار علی بھٹو کی قیادت میں پیپلز پارٹی وجود میں آئی اور سیاست دو حصوں ''بھٹو اور اینٹی بھٹو'' میں تقسیم ہوئی۔ اسٹیبلشمنٹ اینٹی فورسز کی اتحادی تھیں۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد یہ سیاست مرنے مارنے کی لڑائی میں تبدیل ہوئی۔ اس سیاست کا نتیجہ یہ نکلا کہ جمہوریت اور آئین پر غیر منتخب ادارے حاوی ہو گئے اور جب بھی پیپلز پارٹی اقتدار میں آئی، اس کے انتخابی مینڈیٹ کو غیر جمہوری اور غیر آئینی طریقے سے شکار کر لیا گیا۔ یہ ایک تسلسل ہے جو ہمارے ملک میں منتخب حکومتوں کا مستقل

مقدر بنا رہا ہے۔ ملک کی دوسری بڑی سیاسی جماعت مسلم لیگ (ن) کو بھی دو بار اسی سیاسی کھیل کا نشانہ بننا پڑا اور میاں نواز شریف بھی اسی تجربے سے گزرے کہ غیر منتخب طاقتیں مقبول لیڈروں اور جماعتوں کو برداشت نہیں کرتیں۔ نہ صرف ان کا انتخابی مینڈیٹ مکمل نہیں ہونے دیتیں بلکہ ان کی جان کے درپے بھی ہو جاتی ہیں۔ موجودہ جمہوری سیٹ اپ کئی حادثوں سے بچتا ہوا تقریباً پونے تین سال گزار چکا ہے۔ آگے کیا ہوگا؟ کتنے خطرناک موڑ راستے میں ہیں؟ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔

''بینظیر کہانی''میری اُن تحریروں پر مشتمل ہے جو ماضی قریب میں مختلف مواقع پر لکھی گئیں اور روزنامہ ایکسپریس میں شائع ہوئیں۔ ماضی کی یہ کہانی اس لئے بھٹوز کے گرد گھومتی ہے کہ انہوں نے آمریت کے خلاف ہر لڑائی میں اپنے اور اپنی پارٹی کے کارکنوں کے خون کے نذرانے دے کر جمہوریت کی جنگ جیتی۔ اپوزیشن ہو یا اقتدار، پیپلز پارٹی ہمیشہ غیر منتخب طاقتوں کا ہدف بنی رہی لیکن اس نے شکست مانی نہ اپنی جانوں کو عزیز سمجھ کر پسپائی اختیار کی۔ اس معاملے میں میری اپروچ یا نقطہ نظر پر بہت سے اختلافات اور اعتراضات کی گنجائش ہے۔ ہر آدمی کا اپنا اپنا سچ ہوتا ہے لیکن میں اختلافی سچ کا بھی اس لئے احترام کرتا ہوں کہ آزادی اظہار پر ہم سب کا اپنا اپنا اور برابر کا حق ہے۔

عباس اطہر

18 دسمبر 2010ء

■■■

27 دسمبر 2007ء

آج محترمہ بینظیر بھٹو کی کہانی تمام ہوئی اور بھٹوز کی کہانی ایک نیا موڑ مڑ گئی۔

ساری سیاستیں، مخالفتیں، حمائتیں، نفرتیں اور محبتیں، وہ سب کچھ جو بینظیر کی زندگی کا حصہ تھا، ماضی کے اندھیرے میں گم ہو گیا۔

زندگی اور اس کی حقیقت بس اتنی ہی ہے کہ کوئی نہیں جانتا اگلے لمحے نے اپنے دامن میں کیا سمیٹ رکھا ہے۔

محترمہ نے 54 سال عمر پائی جس کے ابتدائی 24 سال عظیم باپ کے ٹھنڈے سائے میں گزرے۔ باقی ماندہ 30 سال دو حکومتوں میں ملنے والے چار سالہ اقتدار کے سوا سیاسی اور ذاتی دکھوں پر مشتمل تھے۔ مجموعی طور پر اسے ایک دکھ بھری زندگی ہی کہا جا سکتا ہے۔ وہ 21 جون 1953ء کو پیدا ہوئیں اور 4 جولائی 1974ء تک یقیناً ایک شاندار زندگی گزاری۔ پہلے کراچی میں تعلیم حاصل کی پھر آکسفورڈ چلی گئیں۔ دوران تعلیم انہوں نے اپنے والد ذوالفقار علی بھٹو کی وزارت عظمیٰ کا زمانہ دیکھا۔ وہ انہیں اپنی جانشین کے طور پر تیار کرنا چاہتے تھے۔ محترمہ کچھ عرصہ پاکستان ٹیلی ویژن پر خارجہ امور پر گفتگو کے ایک پروگرام میں بھی شرکت کرتی رہیں۔ شملہ مذاکرات کے موقع پر بھٹو صاحب انہیں اپنے ساتھ لیکر گئے تھے۔ آکسفورڈ میں اپنی تعلیم مکمل کر کے 24 جون 1977ء کو واپس آئیں۔ 5 جولائی 1977ء کو جنرل ضیاء الحق نے حکومت کا تختہ الٹ کر بھٹو صاحب کو وزیراعظم ہاؤس سے حراست میں لے لیا۔ چند دن بعد وہ رہا ہو کر کراچی چلے گئے اور پھر انہیں انتقام کا نشانہ بنانے کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو

گیا۔ بھٹو صاحب قتل کیس میں گرفتار کئے گئے۔ ضمانت پر رہا ہو کر دوبارہ کراچی واپس آئے تو ایک رات 70 کلفٹن پر دھاوا بول کر پورے گھر کو الٹ پلٹ کرنے کے بعد انہیں مارشل لاء ضابطے کے تحت گرفتار کر لیا گیا۔ مقدمہ چلا، لاہور ہائیکورٹ سے سزائے موت ہوئی۔ پھر سپریم کورٹ سے اس کی توثیق عمل میں آئی۔ 4 اپریل کی رات کو محترمہ بینظیر اپنی والدہ بیگم نصرت بھٹو کے ساتھ سہالہ ریسٹ ہاؤس میں نظر بند تھیں اور چند میل کے فاصلے پر ان کے عالیشان باپ کو راولپنڈی جیل میں پھانسی دی جا رہی تھی۔ تدفین سے پہلے انہیں اپنے باپ کا منہ دیکھنے کی اجازت بھی نہیں ملی۔ باپ کے قتل کے بعد ہتھیار ڈالنے کے بجائے انہوں نے اپنے آپ کو ایک بہادر بیٹی ثابت کیا اور بیگم نصرت بھٹو کی معیت میں انتخابی مہم شروع کر دی۔ انتخابی جلسوں میں پیپلز پارٹی صاف جیتی نظر آتی تھی۔ اس لئے ضیاء الحق 90دن میں انتخابات کرانے کے وعدے سے منحرف ہو گئے۔

جس سیاسی زندگی کا خاتمہ 27 دسمبر 2007ء کی شام کو راولپنڈی کے لیاقت باغ میں ہوا اس کی ابتدا کا ایک منظر انہوں نے اپنی کتاب میں لکھا ہے۔ ملاحظہ ہو۔ ''میں چھوٹے جیلر کے سامنے بے بس کھڑی تھی اور میرے ہاتھوں میں بچے کھچے سامان کی ایک چھوٹی سی پوٹلی تھی اور بس۔ کولون شالیمار کے عطر کی خوشبو ان کے کپڑوں سے ابھی تک آ رہی تھی، میں نے ان کی قمیض کو اپنے ساتھ بھینچ لیا اور مجھے اچانک کیتھلین کینیڈی یاد آ گئی۔ جس نے ریڈ کلف میں اپنے سینیٹر والد کے قتل کے بعد اس کا لباس پہن لیا تھا''۔

محترمہ نے باپ کا لباس تو نہیں پہنا لیکن ان کا پرچم اٹھا کر اپنی جنگ جاری رکھی۔ چھ مرتبہ نظر بندی کاٹی، جس میں سکھر جیل کی قید سخت بھی شامل تھی۔ ظلم کے ایک طویل سلسلے سے گزر کر وہ وطن چھوڑ گئیں لیکن لندن میں بیٹھ کر پارٹی کی قیادت کرتی رہیں۔ 9 اپریل 1986ء کو جلا وطنی ختم کر کے لاہور واپس آئیں اور ان کا شاندار استقبال ملک کی تاریخ کا حصہ بن گیا۔ 1988ء کے انتخابات میں سب سے زیادہ نشستیں لینے والی پارٹی کی سربراہ کے طور پر انہیں وزارت عظمیٰ مل گئی۔ یہ اقتدار 18 ماہ بعد ختم ہو گیا۔ 1993ء میں وہ زیادہ

طاقت سے منتخب ہو کر دوبارہ اقتدار میں آئیں لیکن یہ دوسری حکومت صرف ڈھائی سال چل سکی اور انہیں برطرف کر کے کرپشن کے ان گنت مقدمات میں پھنسا لیا گیا۔ ایک مقدمے میں سزا سنائے جانے سے ایک دن پہلے وہ ملک سے باہر چلی گئی تھیں۔ یہ جلا وطنی 18 اکتوبر 2007ء کو ختم ہوئی اور انہوں نے اس شان سے لینڈ کیا کہ مزار قائداعظم تک لاکھوں لوگ ان کے استقبال کیلئے جمع تھے۔ جلاوطنی کے زمانے میں بینظیر کے سب سے چھوٹے بھائی شاہنواز بھٹو کی پراسرار موت ہوئی، دوسرے اقتدار کے خاتمے سے پہلے ان کے بھائی مرتضٰی بھٹو کو کراچی کی سڑک پر قتل کر دیا گیا۔

سینٹر ایڈورڈ کینیڈی نے اپنے دو بڑے بھائیوں کے قتل کے بعد امریکی صدارت کی خواہش ہمیشہ کیلئے ترک کر دی تھی لیکن بینظیر کا حوصلہ اس کے باوجود برقرار رہا کہ کراچی کے استقبال کے دوران دو خودکش بم دھماکوں میں وہ بال بال بچی تھیں۔ موت کا سایہ سر پر مسلسل منڈلاتا رہا لیکن انہوں نے اپنی انتخابی مہم جاری رکھی۔ محترمہ ووٹوں کی طاقت سے جیتنے اور تیسری بار اقتدار میں آنے کیلئے پرامید تھیں۔ اقتدار شاید اس لئے ہمیشہ ان کی سیاست کا ہدف رہا کہ وہ اپنے مقتول باپ کے مشن سے کسی قیمت پر دستبردار ہونے کیلئے تیار نہیں تھیں۔ پاکستان کے حوالے سے ذوالفقار علی بھٹو کے کچھ خواب تھے جس میں ہمارا ایٹمی پروگرام بھی شامل ہے۔ انہی خوابوں کی تعبیر کے سلسلے میں محترمہ نے پاکستان کو میزائل ٹیکنالوجی کا تحفہ دلوایا۔

بھٹو، پیپلز پارٹی اور بینظیر کیلئے میں نے اپنے عقیدت بھرے جذبات کبھی نہیں چھپائے۔ میں بینظیر صاحبہ پر نکتہ چینی بھی کرتا رہا ہوں۔ خاص طور پر اس حوالے سے کہ انہوں نے بار بار اسٹیبلشمنٹ سے دھوکے کھائے لیکن مفاہمت کا راستہ نکالنے کیلئے اس پر اعتبار کرتی رہیں اور آخر میں یہ اندازہ بھی نہیں لگا سکیں کہ ملک کے اندر موجود بھٹو کی مخالف طاقتیں ان کا وجود برداشت نہیں کر سکتیں اور ان کا یہ آخری سیاسی معرکہ ایک ناگہانی موت پر آ کر ختم ہو سکتا ہے۔

27دسمبر2007ء

میں بہت کچھ لکھنا اور بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں لیکن قلم ساتھ دے رہا ہے نہ دماغ۔ میرے سامنے ٹیلی ویژن سکرین پر محترمہ بینظیر کا بند تابوت ان کی آخری آرام گاہ کی طرف روانہ ہے۔ وہ دنیا سے اس طرح رخصت ہوئیں کہ گردن اور سر پر گولیوں کے دو زخم تھے اور دل پر باپ اور دو بھائیوں کے قتل کے داغوں کے علاوہ ایک ایسی ماں کا بوجھ تھا جو مرتضٰی بھٹو کے قتل کے بعد ایک چلتی پھرتی لاش میں تبدیل ہو چکی ہیں۔

ذوالفقار علی بھٹو نے ایک ہارے ہوئے ملک کو نئی زندگی دی۔ لیکن اسٹیبلشمنٹ نے ان کے خاندان کا آخری سیاسی چراغ بھی گل کر دیا۔ یہ ایک ایسا عالمی سانحہ ہے جس پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک نامور بھارتی صحافی نے کہا ''آج پاکستان دنیا میں اپنے ''شناختی کارڈ'' سے محروم ہو گیا ہے''۔

■ ■ ■

29دسمبر2007ء

بھٹو صاحب کا تابوت راولپنڈی جیل سے ہوائی جہاز میں سکھر بھیجا گیا تھا۔ بینظیر بھٹو کا تابوت سنٹرل ہسپتال راولپنڈی سے برآمد ہوا۔ چکلالہ ائربیس پر ایک سی ون تھرٹی میں رکھا گیا پھر بھٹو کی طرح ان کی بیٹی کی نعش بھی مختلف منزلیں طے کرتی ہوئی گڑھی خدا بخش پہنچی اور وہ اپنے باپ کے پہلو میں ہمیشہ کیلئے منوں مٹی کے نیچے دفن ہو گئیں۔ باپ بیٹی کا سفر ایک ہی طرح کا تھا لیکن انداز مختلف تھا۔ بھٹو صاحب کی نعش کو رات کے اندھیرے میں خاموشی سے دفن کرنے کیلئے جیل سے ''اغوا'' کیا گیا تھا، چند وارثوں کو گواہ بنا کر قبر میں اتارا گیا اور پھر کافی عرصے کیلئے قبر پر پہرہ لگا دیا گیا تھا۔ بینظیر کا آخری سفر ان کی ''عوامی شان وشوکت'' کے ساتھ پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ پورے ملک میں سناٹا اور سوگ ویسا ہی تھا جو 4 اپریل 1979ء کو فضا میں چھایا ہوا تھا۔ آنسوؤں کے دریا بھی اسی طرح بہے۔ ماتم بھی ویسا ہی ہوا۔ لیکن اس مرتبہ لوگوں کو جنازے میں حصہ لینے اور

رونے دھونے کی کھلی اجازت تھی۔ ضیاء الحق کو اپنی کارروائی کی سنگینی اور اس کے خلاف بڑے پیمانے پر ردعمل پھیلنے کا ڈر تھا اس لئے انہوں نے حالات کو قابو میں رکھنے کے انتظامات کر رکھے تھے۔ محترمہ بینظیر کی شہادت کے بعد ہمارے حکمرانوں نے واقعہ کی سنگینی کو سمجھا نہ فوری طور پر ایسے اقدامات کئے کہ بھڑکے ہوئے جذبات سے مغلوب ہجوموں یا ایسے مواقع سے فائدہ اٹھانے والے گروہوں کے ہاتھ روکے جا سکیں نتیجہ یہ نکلا کہ شہر شہر تشدد اور تباہی کے واقعات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اندرون سندھ ہر طرف آگ لگ گئی۔ سرکاری املاک کے ساتھ ساتھ عام شہریوں کے خلاف بھی لوٹ مار ہوتی رہی۔ سینکڑوں کی تعداد میں پرائیویٹ گاڑیاں اور جائیدادیں نذر آتش ہوئیں اور دو درجن سے زائد بے گناہ لوگ مارے گئے۔ مشرف حکومت کو حق ہے کہ وہ اپنی ذمہ داری قبول نہ کرے اور یہ کہہ کر اپنے آپ کو فارغ سمجھ لے کہ وہ بے بس تھی۔ ایک مجبور حکومت کو چیلنج تو نہیں کیا جا سکتا۔

راجیو گاندھی کے قتل کے بعد عام تاثر یہ تھا کہ نہرو خاندان کی سیاست کا دور ختم ہو گیا ہے لیکن کانگریس نے اپنا سیاسی وجود برقرار رکھنے کیلئے اسے سونیا گاندھی سے منسلک کر دیا۔ آگے چل کر راجیو گاندھی کے بچے اپنے باپ، نانا اور اپنی دادی کے ورثے کے دعویدار بن سکتے ہیں۔ بھٹو صاحب نے گرفتاری کے بعد اپنے دونوں بیٹے ملک سے باہر بھجوا دیئے تھے اور سیاسی ورثہ بیگم نصرت بھٹو اور محترمہ بینظیر کے سپرد کر دیا تھا جسے قائم رکھنے کیلئے انہوں نے زخم کھائے۔ آخر میں ماں جیتے جی مر گئی اور بیٹی شہید ہو گئی۔ مرتضٰی بھٹو وطن واپس آ کر سندھ میں اپنی جانشینی نہیں منوا سکے۔ وہ الیکشن بھی صرف ایک صوبائی نشست سے جیتے اور وہ بھی اس طرح کہ بیگم نصرت بھٹو نے گھر گھر جا کر ان کیلئے ووٹ مانگے تھے۔ بینظیر صاحبہ کے دور حکومت میں مرتضٰی بھٹو کے قتل کے بعد ان کی بیوہ غنویٰ بھٹو کو مظلوم ہونے کے باوجود کوئی پذیرائی نہیں ملی۔ ان کے بچے فاطمہ بھٹو اور ذوالفقار علی بھٹو جونیئر ابھی عمر کے اس حصے میں ہیں کہ بھٹو صاحب اور محترمہ بینظیر کے سیاسی ورثے کو اپنی طرف نہیں کھینچ سکتے۔ محترمہ کی چھوٹی بہن صنم بھٹو نے کبھی سیاست میں دلچسپی نہیں لی، وہ تدفین میں شرکت کیلئے لندن سے آئیں

لیکن انہیں اپنی بہن کی جانشینی کا کوئی شوق تھا، نہ ہے۔ محترمہ کی شہادت کے بعد غنویٰ بھٹو اور ان کے بچوں نے پیشکش کی تھی کہ بیٹی کا جنازہ باپ کے گھر میں آئے اور وہیں سے اٹھایا جائے لیکن آصف زرداری' ان کے بچے اور پارٹی کے دوسرے لیڈر نہیں مانے۔ مرتضیٰ کی بیوہ اور بچے مانوس اجنبیوں کی طرح تدفین کی رسومات میں شریک ہوئے۔ ماضی کی تلخیوں کے نتیجے میں وہ اتنے پرائے ہو چکے ہیں کہ دوبارہ ''اپنے'' نہیں بن سکتے۔ سیاست کا منتہائے مقصود اقتدار ہوتا ہے اور اقتدار سفاک حقیقتوں اور رویوں کا نام ہے جن میں لچک کی گنجائش نہیں ہوتی۔ وقت کی حقیقت یہ ہے کہ ذوالفقار علی بھٹو اور محترمہ بینظیر کی سیاست اور شہادت کی وراثت پر آصف علی زرداری اور بلاول کا حق تسلیم کرنا پڑے گا۔ جنازے اور تدفین کے موقع پر دونوں باپ بیٹے شانہ بہ شانہ اس حق پر حاوی تھے اور مرتضیٰ بھٹو کا خاندان غیروں کی طرح دور دور رہا۔

عہدہ یا تعلق خواہ کوئی بھی ہو آئندہ پیپلز پارٹی کے سرپرست آصف علی زرداری ہی ہوں گے۔ یہ پارٹی اب ایک کے بجائے دو شہیدوں کا پرچم اٹھا کر آگے چلے گی اور یہ دوسری شہادت اتنی اچانک اور المناک ہے کہ پہلی کے ساتھ ساتھ قدم ملا کر چلے گی۔ بھٹو صاحب کو 4 اپریل 1979ء کو سزائے موت دی گئی، یہ قتل آج تک قومی مرثیہ بن کر سیاست پر چھایا ہوا ہے۔ اب یہ دوسرا قتل اگلی نسلوں تک مظلومیت کا نشان بن کر آئندہ سیاست کا عنوان بنا رہے گا۔

■ ■ ■

30 دسمبر 2007ء

ایک عام تاثر یہ ہے کہ جاگیردار بنیادی طور پر اتنے بہادر نہیں ہوتے کہ موت سامنے کھڑی ہو اور وہ راستہ بدلنے کے بجائے سیدھے اس سے ٹکرا جائیں۔ سر شاہنواز بھٹو کی اولاد میں سے ذوالفقار علی بھٹو، اپنے سوتیلے اور بڑے بھائیوں سے بالکل مختلف شخصیت کے حامل تھے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ایک ایسی ماں کے

بیٹے تھے جو متوسط طبقے سے تعلق رکھتی تھیں۔ جاگیردار خاندان میں انہیں وہ عزت کبھی نہیں ملی جس کی وہ مستحق تھیں۔ اس رویے نے بھٹو صاحب کی شخصیت کے اس رخ کو پروان چڑھایا جو بغاوت اور مزاحمت سے عبارت تھا۔ 1970ء کا الیکشن جیتنے کے بعد ایک پریس کانفرنس میں اپنے اس پس منظر کی وضاحت کرتے ہوئے، آنکھوں میں آنسو بھر کر بھٹو صاحب نے کہا ''ہر کوئی میرے والد کا حوالہ دیتا ہے جبکہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ میں ایک غریب ماں کا بیٹا ہوں۔ میں جاگیردارانہ سماج کے ظالمانہ نظام کے کردار سے آگاہ ہوں بلکہ میں خود ایک وقت تک جاگیردارانہ استحصال کا نشانہ بنتا رہا ہوں''۔

بھٹو صاحب نے اپنی تصنیف ''اگر مجھے قتل کیا گیا'' میں اپنے بچپن کا ایک واقعہ تحریر کیا ہے جو یوں ہے:۔

''1935ء میں جب میری عمر سات برس تھی میرے والد اس وقت بمبئی کی حکومت میں وزیر تھے۔ ایک دن بمبئی کے گورنر لارڈ برابورن نے میرے والد کو تینوں بیٹوں کے ہمراہ چائے کی دعوت پر بلایا۔ جب میرے بڑے بھائی امداد علی جن کی عمر 21 برس تھی کا تعارف ہو چکا تو گورنر نے بھائی کے بارے میں کہا ''کتنا خوبصورت اور جوان آدمی ہے'' امداد علی نے ایک تربیت یافتہ ارسٹوکریٹ ہوتے ہوئے جواب دیا ''میں اپنے آپ کو بہت مسرور اور مغرور سمجھتا ہوں کیونکہ میری تعریف ہمارے خوبصورت گورنر نے کی ہے'' جب میری باری آئی تو میں نے باریک آواز میں کہا ''یہ گورنر صاحب اس لئے خوبصورت ہیں کہ وہ ہمارے خوبصورت ملک کے خون پر پل رہے ہیں'' لارڈ برابورن اس جواب پر ششدر رہ گیا۔ ایک لمحے تک وہ حیرت زدہ میری طرف دیکھتا رہا اور پھر میرے والد سے کہنے لگا ''اس بیٹے کی شکل میں شاہنواز آپ کو ایک شاعر اور انقلابی ملا ہے۔ یہی کچھ ہے جو میں ان سارے برسوں میں رہا ہوں ''ایک شاعر اور ایک انقلابی'' اور جب تک میرے جسم سے آخری سانس نہیں نکل جاتی میں ایسا ہی رہوں گا''۔ واپسی پر میرے والد نے کہا ''سائیں وہ بات وہاں کرنے کی کیا ضرورت تھی'' میں نے اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے چھپاتے ہوئے جذباتی انداز میں کہا

''یہ ہمارا ملک ہے، یہ ہمارا ملک ہے، یہ ہمارا ملک ہے''۔

بھٹو کے کلاس فیلو اور قریبی دوست پیلو مودی نے اپنی کتاب ''زلفی مائی فرینڈ'' میں لکھا ہے۔ ''زلفی جناح کا پکا پیروکار تھا۔ دو قومی نظریے کی وکالت کرتا تھا اور سمجھتا تھا کہ مسلمان پاکستان کے بغیر اپنے حقوق اور مفادات کا تحفظ نہیں کر سکتے'' پاکستان بننے کے بعد ذوالفقار علی بھٹو سے لے کر محترمہ بینظیر تک، بھٹوز (شاہنواز اور مرتضٰی بھٹو سمیت) اسی ضد پر قائم رہ کر لڑتے لڑتے مارے گئے کہ ''یہ ہمارا ملک ہے''۔ ایوب خان کے دور میں ذوالفقار علی بھٹو نے پہلے وزیر معدنیات اور پھر وزیر خارجہ کے طور پر پاکستان کو امریکہ کے مکمل شکنجے سے نکال کر چین کی طرف راستہ بنایا۔ کشمیر کیلئے پاکستان کی جنگ کو ''ہم ہزار سال تک لڑیں گے'' کا عنوان دیا۔ ملک ٹوٹنے کے بعد انہوں نے مغربی پاکستان کو ''نئے پاکستان'' کے طور پر دوبارہ طاقتور بنایا۔ وہ امریکہ کی ایماء پر اقتدار میں آئے تھے لیکن اسلامی کانفرنس اور ایٹمی پروگرام شروع کرنے جیسے اقدامات کر کے ''واجب القتل'' ٹھہرے۔ سزائے موت سننے کے بعد وہ چند سطری معافی نامہ لکھ کر سیاست سے دستبرداری کا اعلان کر دیتے تو اپنی جان بچا سکتے تھے لیکن سر جھکانے کے بجائے انہوں نے پھانسی قبول کر لی۔

محترمہ بینظیر بھٹو کو باپ اور ماں دونوں کی طرف سے جنگجوئی کا جذبہ ملا تھا۔ بیگم نصرت بھٹو نے ایوب دور میں اپنے خاوند کی گرفتاری کے بعد سڑکوں پر نکل کر لڑائی لڑی اور ضیا دور میں سر پر لاٹھیاں کھا کر لہولہان ہونے کے باوجود حوصلہ نہیں ہارا۔ باپ کی پھانسی کے بعد محترمہ بینظیر اسٹیبلشمنٹ کی سختیاں اور جیلیں کاٹ کر ملک سے باہر چلی گئی تھیں لیکن جنرل ضیا کی زندگی میں ہی 10 اپریل 1986ء کو واپس لوٹیں اور دو مرتبہ اقتدار میں آئیں۔ دوسری وزارت عظمٰی کے دوران اپنے بھائی مرتضٰی کو قتل ہوتے دیکھا۔ ساتھ ہی اقتدار سے نکال دی گئیں اور پھر انہیں مقدمات کے ایک طویل سلسلے میں الجھا دیا گیا اور ایک بار پھر وطن چھوڑنا پڑا۔

لندن اور پھر دبئی میں، پیپلز پارٹی کے بہت سے لوگ محترمہ کے پاؤں پکڑ پکڑ کر یہ

فریاد کرتے رہے کہ ''وہ پاکستان کو بھول جائیں، انہیں قتل کر دیا جائیگا'' لیکن وہ موت کے سفر پر روانہ ہونے کیلئے تلی ہوئی تھیں۔ مجھے یقین ہے کہ آصف زرداری اور بچوں نے بھی انہیں روکا ہوگا لیکن یہ بھٹوز موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر لڑ جانا اپنے ایمان کا حصہ سمجھتے ہیں۔ محترمہ کو موت کا خوف ہوتا تو وہ باپ کی پھانسی کے بعد بھول جاتیں کہ یہ ''ہمارا ملک ہے''۔ وہ اپنی جنگجویانہ فطرت سے مجبور نہ ہوتیں تو 18 اکتوبر کے بم دھماکوں کے بعد کراچی لاڑکانہ یا دبئی کی چار دیواریوں میں محدود ہو جاتیں اور پارٹی قیادت کو الیکشن لڑنے دیتیں لیکن وہ تو باقاعدہ وصیت لکھ کر اور اپنی قبر کی جگہ کی نشاندہی کر کے جنگ پر نکلی تھیں۔

■ ■ ■

2جنوری 2008ء

کہا جاتا ہے کہ محترمہ جلسہ ختم ہونے کے بعد گاڑی کی ''سن روف'' ہٹا کر کھڑی نہ ہوتیں تو اس خاص وقت پر گولی یا گولیوں سے بچ سکتی تھیں لیکن قاتل جو بھی تھے، وہ تو مسلسل ان کے پیچھے لگے ہوئے تھے، یہ واقعہ لیاقت باغ میں نہ ہوتا تو پنجاب کے کسی اور شہر میں ہو جاتا کیونکہ کسی نہ کسی وجہ سے یہ سانحہ پنجاب کے کھاتے میں ڈالنا مقصود تھا۔

ذوالفقار علی بھٹو ہوں یا محترمہ بینظیر، دونوں اس خطے کی نئی جغرافیائی تقسیم کے عالمی منصوبے میں حصہ دار بن سکتے تھے نہ ہی وہ پاکستان کو مزید توڑنے کی خواہشمند طاقتوں کے آلہ کار بننے پر تیار تھے۔ بھٹو صاحب امریکہ سے مغربی پاکستان کے تحفظ کی ضمانت لیکر برسر اقتدار آئے تھے پھر ایٹمی پروگرام پر امریکہ سے لڑ گئے۔ محترمہ بینظیر بھی 1986ء میں امریکہ سے اپنی جان کا تحفظ لیکر پاکستان واپس آئیں اور اس مرتبہ بھی امریکہ اور برطانیہ ہی ان کی سلامتی کے ذمہ دار بنے تھے۔ دو مرتبہ اقتدار میں رہنے کے دوران خدا جانے وہ امریکہ کے کونسے ارادوں کی راہ میں مزاحم ہوئیں کہ انہیں 9 سال کیلئے دربدر ہونا پڑا۔ امریکہ کے ساتھ بھٹوز کا

محبت اور نفرت کا عجیب سا رشتہ تھا۔ بھٹوز امریکہ کو اپنے ناگزیر ہونے کا قائل بھی کر لیتے تھے لیکن اقتدار میں آ کر یہ ''ہمارا ملک ہے'' والا ایجنڈا نکال کر بیٹھ جاتے تھے اور پھر کام خراب ہو جاتا تھا۔

1996ء میں جب یہ طے ہو چکا تھا کہ محترمہ بینظیر کو اقتدار اور سیاست سے ہمیشہ کیلئے رخصت کرنا ہے تو میر مرتضٰی بھٹو کو اس لئے قتل کرا دیا گیا کہ وہ متبادل قیادت بن سکتے تھے۔ ذمہ دار کون تھا آج تک یہ تعین نہیں ہو سکا لیکن کوئی نہ کوئی بین الاقوامی اور قومی مافیاز بھٹوز کو ملیا میٹ کر کے سندھ کے قوم پرستوں کیلئے راستہ صاف کرنا چاہتے ہیں۔ یہ کوئی سازش ہے تو اس کا تعلق ان نقشوں سے جوڑنے میں کوئی ہرج نہیں جو اس خطے کی تقسیم نو پر مبنی ہیں اور منظر عام پر لائے جا چکے ہیں۔

یہ سوال اپنی جگہ معنی خیز ہے کہ وزارت داخلہ کے ایک ترجمان نے محترمہ کی شہادت کے بعد کبھی اچانک دل بند ہونے اور کبھی کنپٹی پر لیور لگنے کی تھیوریاں کیوں پیش کیں جبکہ نجی ٹی وی چینل گولی چلانے کے مناظر دکھا رہے تھے۔ اس سانحہ کی سنگینی کم کرنا مقصود تھی تو بڑی آسانی سے یہ بھی کہا جا سکتا تھا کہ خدا کو یہی منظور تھا یا ہمارے اس عقیدے کا حوالہ دیا جا سکتا تھا کہ موت کا دن مقرر ہے اور اسے ٹالا نہیں جا سکتا۔

محترمہ بینظیر کی وصیت سامنے آنے سے پہلے ان کی جانشینی کے معاملے کو متنازعہ بنانے کی کوشش کی گئی۔ یہ بھی سوچا گیا ہے کہ یہ پارٹی، جو وفاق کی علامت ہے، مختلف حصوں میں بٹ جائے جانشینی کے معاملے میں قیاس آرائیاں بلا جواز تھیں اس حوالے سے کچھ مثالیں پہلے ہی موجود ہیں۔ پنڈت جواہر لال نہرو کی اولاد نرینہ نہیں تھی۔ ان کا سیاسی ورثہ اندرا گاندھی کو منتقل ہوا۔ وہ ابتدا میں اپنے بیٹے سنجے گاندھی کو اپنا سیاسی جانشین بنانے کے لئے سیاست میں لے آئیں، سنجے گاندھی ایک ہوائی حادثے میں ہلاک ہو گئے۔ پھر انہوں نے اپنے دوسرے بیٹے راجیو گاندھی کو جو ایئر لائن پائلٹ تھا اور جس کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں تھا، اپنے جانشین کے طور پر پاس بلا لیا۔ اندرا کا سیاسی ورثہ راجیو کو منتقل ہوا۔ پھر راجیو ایک

خودکش بم دھماکے میں ہلاک ہو گئے۔ سنجے اور راجیو دونوں نہرو خاندان کے نہیں فیروز گاندھی کے بیٹے تھے جو اپنی زندگی میں ہی اندرا گاندھی سے علیحدگی اختیار کر چکے تھے۔ کانگریس نے راجیو گاندھی کو نہرو خاندان کا تسلسل تسلیم کیا اور پھر یہ وراثت اطالوی نژاد سونیا گاندھی کو منتقل ہو گئی۔ جہاں سے یقیناً راجیو کی اولاد کو منتقل ہو گی۔ سیاسی ورثے کسی قانون وراثت کے تحت تقسیم نہیں ہوتے۔ عوامی جماعتوں اور عوام کے جذبات کے مرہون منت ہوتے ہیں۔ کانگریس سونیا گاندھی کی قیادت میں اقتدار میں واپس آئی، جس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ عوامی جذبے وراثت کے اصول خود وضع کرتے ہیں اور سیاست میں جانیں دینے والوں کے وارثوں یا جانشینوں کا انتخاب ایک جذباتی عمل ہے۔ فلپائن کی فوج نے مسٹر اکینو کو ایئرپورٹ پر قتل کر دیا تھا۔ فلپائنی عوام نے ان کی غیر سیاسی بیوی کوری اکینو کو اپنا لیڈر چن لیا۔ بنگلہ دیش میں شیخ مجیب الرحمٰن اور جنرل ضیاء الرحمٰن کی سیاسی وراثت بالترتیب بیگم حسینہ واجد اور بیگم خالدہ ضیاء کو منتقل ہوئی حالانکہ دونوں کا اپنی اپنی پارٹیوں میں کوئی مقام تھا، نہ انہوں نے پہلے کبھی سیاست میں حصہ لیا تھا۔ سری لنکا میں وزیراعظم بندرا نائیکے کے قتل کے بعد ان کی بیٹی سیاسی وارث بنی۔ انڈونیشیا میں صدر سوئیکارنو کی حکومت کا تختہ الٹ کر انہیں نظر بند کر دیا گیا تھا اور اسی حالت میں وہ دنیا سے رخصت ہو گئے تھے لیکن سہارتو کے تین عشروں کے اقتدار کے بعد انڈونیشیا کے عوام ان کی بیٹی سوئیکارنو پتری کو اقتدار میں لے آئے۔ برما میں آنگ سانگ سوچی اپنے والد کی سیاسی وارث ہیں اور ظلم کا مقابلہ کئے جا رہی ہیں۔ جس کے نتیجے میں وہ نوبل انعام پا چکی ہیں۔ ہمارے اپنے ملک میں خان عبدالولی خان کا سیاسی ورثہ اسفند یار ولی کو۔ عبدالصمد اچکزئی کا محمود اچکزئی کو، اکبر بگٹی کا طلال بگٹی کو، عطاء اللہ مینگل کا اختر مینگل کو اور چودھری ظہور الٰہی کا چودھری پرویز الٰہی اور چودھری شجاعت حسین کو منتقل ہوا۔ اسی طرح ہمارے بابائے جمہوریت نوابزادہ نصراللہ خان کے سیاسی وارث ان کے صاحبزادے منصور علی خان ہیں۔

وراثتی سیاست ہمارے خطے میں کوئی نئی بات نہیں، بیویاں اور بیٹے موجود ہوں تو یہ

وراثت براہ راست ان کو منتقل ہو جاتی ہے اور بیٹیوں کی صورت میں وہ نواسے نواسیوں کی طرف چلی جاتی ہے۔ محترمہ بینظیر کی شہادت تک پیپلز پارٹی ذوالفقار علی بھٹو کی وراثت تھی۔ جسے بینظیر صاحبہ نے 1979ء میں بیگم نصرت بھٹو کے سائے میں سنبھالا اور پھر بلاشرکت غیرے اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ مرتضٰی بھٹو کی وطن واپسی کے بعد بھی یہ وراثت تقسیم ہو کر بھٹو کے بیٹے کی طرف نہیں گئی۔ مرتضٰی کے قتل کے بعد غنویٰ بھٹو نے محترمہ بینظیر اور زرداری کو بالواسطہ طور پر قتل کا ملزم قرار دیکر بھی بھٹو کی سیاسی وراثت کی طرف راستہ بنانے کی کوشش کی تھی۔ ان کی صاحبزادی فاطمہ بھٹو اپنے مضامین (اور اپنی کتاب) میں بینظیر صاحبہ کو مسلسل ہدف ملامت بھی بناتی رہیں لیکن اب سانحہ لیاقت باغ پر غنویٰ بھٹو نے بلاول کی بھٹو قبیلے میں شمولیت اور چیئرمین پارٹی بننے پر خاموشی اختیار کر لی ہے۔ غنویٰ کے بچے بھی پیپلز پارٹی کی سنٹرل کمیٹی کے فیصلے کو چیلنج نہیں کر رہے۔ رہے ممتاز بھٹو تو وہ محترمہ بینظیر بھٹو کے کھلے مخالف ہیں اور اس خاندان میں شمار ہی نہیں ہوتے جو ذوالفقار علی بھٹو سے آگے چلا اور محترمہ بینظیر سے گزرتا ہوا آصف زرداری اور بلاول بھٹو زرداری تک پہنچا ہے۔

■ ■ ■

3جنوری 2008ء

ذوالفقار علی بھٹو کا ورثہ محترمہ بینظیر کو منتقل ہوا تھا۔ حالات بہت برے تھے لیکن پیپلز پارٹی کی اصل طاقت قائم رہی۔ تقریباً 28 سال کے عرصے میں محترمہ کو تقریباً 4 سال کا اقتدار ملا۔ اس کے باوجود پیپلز پارٹی کو کوئی خاص نقصان نہیں پہنچا۔ بھٹو صاحب کے دور کے بڑے بڑے نام عبدالحفیظ پیرزادہ، ڈاکٹر مبشر حسن، غلام مصطفٰی جتوئی، آفتاب احمد شیر پاؤ، فاروق لغاری (صدارت حاصل کر کے بینظیر حکومت توڑنے کے بعد) غلام مصطفٰی کھر (کبھی راضی ہوئے، کبھی ناراض ہوئے) اور دوسرے چند لیڈر محترمہ کے ''انکل شکن'' رویے کی وجہ سے پارٹی چھوڑ گئے۔ مرتضٰی بھٹو کی اہلیہ غنویٰ بھٹو

سمیت پیپلز پارٹی کے چھوٹے چھوٹے گروپ بھی بنے۔ لیکن جنرل مشرف کے تحت 2002ء کے الیکشن تک بھی صورتحال یہ تھی کہ پیپلز پارٹی سب سے زیادہ ووٹ لے گئی۔ نشستوں کی تعداد بھی اتنی زیادہ تھی کہ راؤ سکندر اقبال کی قیادت میں ایک بڑا گروپ فلور کراس نہ کرتا تو میر ظفر اللہ جمالی کی حکومت نہ بن سکتی۔

ہر بحران میں بھٹو فیکٹر پارٹی کا سہارا بنتا رہا۔ محترمہ بینظیر کی شہادت کے بعد سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ بھٹو فیکٹر کس طرح قائم رکھا جائے۔ مرتضٰی بھٹو کا خاندان پہلے ہی الگ ہو چکا ہے۔ صنم بھٹو صاحبہ نے کبھی اپنی ذاتی زندگی پر سیاست کو ترجیح نہیں دی۔ ممتاز بھٹو یا کوئی بھی دوسرا بھٹو ذوالفقار علی بھٹو کے خاندان سے ایسا کوئی تعلق نہیں رکھتا کہ سیاسی وراثت پر دعویٰ منوا سکے۔ صورتحال کا دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ 20 سالہ جدوجہد کے نتیجے میں ذوالفقار علی بھٹو کا سیاسی ورثہ محترمہ بینظیر کی ذات میں اس طرح مدغم ہو چکا ہے کہ انہی کا تسلسل پارٹی کی شناخت بنے گا۔ قانون وراثت سیاسی وارثوں پر لاگو نہیں ہوتا لیکن اس کے مطابق بھی محترمہ بینظیر کی وراثت ان کے بیٹے، دونوں بیٹیوں اور خاوند کے سوا کسی کے پاس نہیں جاتی۔

محترمہ نے اپنی وصیت میں آصف زرداری کو اپنا جانشین نامزد کیا تھا۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ آصف زرداری حکومتوں اور اپوزیشن کے ادوار میں محترمہ کے ہر سیاسی عمل اور راز میں شریک رہے۔ امریکہ میں قیام کے دوران زرداری صاحب نے وہاں کے حکمران حلقوں میں ایک موثر لابی بنائی جو محترمہ کی وطن واپسی کی بنیاد بنی۔ برطانیہ میں رحمان ملک نے بینظیر صاحبہ کی قبولیت کا راستہ ہموار کیا۔ یہ بین الاقوامی جوڑ توڑ بنیادی طور پر آصف زرداری کے ''کمال فن'' کا نتیجہ تھا۔ جو کارگر ثابت ہوا۔

آصف زرداری نے مجموعی طور پر گیارہ سال جیل کاٹی۔ اس طویل قید میں انہوں نے بہت کچھ پڑھا اور سیکھا۔ 2002ء کے انتخابات کے بعد جب امین فہیم کو وزیر اعظم بنانے کی پیشکش ہوئی اور بعد میں صدر مشرف کے ساتھ مفاہمت کے بالواسطہ مذاکرات ہوتے رہے اس وقت بھی آصف زرداری کو بنیادی اہمیت حاصل تھی اور صدر مشرف کے بعض اہم مشیر

جیل میں جا کر ان سے بات چیت کرتے تھے۔

اگر موجودہ پیپلز پارٹی کی رگ رگ سے کوئی واقف ہے تو وہ صرف آصف زرداری ہیں۔ اس وقت پارٹی کی قیادت وہی سنبھال سکتے ہیں۔ فی الحال انہوں نے اپنے بیٹے بلاول زرداری کے نام کے درمیان بھٹو کا اضافہ کر کے انہیں پارٹی چیئرمین نامزد کرا دیا ہے اور خود شریک چیئرمین کا عہدہ سنبھال لیا ہے۔

ہمارے ملک کی ایک رسم ہے کہ جب لڑکے والے لڑکی کا رشتہ مانگنے جاتے ہیں تو گزارش یوں کی جاتی ہے کہ آپ ہمارے بیٹے کو اپنی ''فرزندی'' میں قبول کر لیں۔ بڑی بہنوں کے خاوند عام طور پر خاندان میں بھائیوں کے برابر سمجھے جاتے ہیں اور ان کے سسرالی خاندان انہیں معتبر اور بڑا تسلیم کرتے ہیں۔ میں نے اس سے پہلے بھی یہ بات لکھی تھی کہ 27 دسمبر کو محترمہ بینظیر کے جس سیاسی ورثے کا سوال اٹھا، اس میں بھٹو صاحب کے خون کے ساتھ محترمہ کا تازہ خون بھی شامل تھا اور یہ ورثہ اسی طرح محترمہ کے خاندان کو ہی جانا چاہئے تھا۔ جس اصول کی بنیاد پر راجیو گاندھی کا ورثہ سونیا گاندھی کو منتقل ہوا، محترمہ کے بچے کم عمر ہیں اس لئے آصف زرداری ہی اس سیاسی ورثے کے مالک بنتے تھے۔ سیدھے الفاظ میں اسے یوں بھی بیان کیا جا سکتا ہے کہ ''حق بہ حقدار رسید''۔

آصف زرداری بلوچ سندھی ہیں۔ وہ روانی سے اردو بولتے ہیں، انگریزی زبان انگریزوں جتنی جانتے ہیں۔ سندھی ان کی مادری زبان ہے اور پنجابیوں سے زیادہ ٹھیٹھ پنجابی بول لیتے ہیں۔ تدفین کے بعد اپنی پریس کانفرنس میں انہوں نے بھٹوز کے متحدہ پاکستان سے متعلق نظریے پر اپنے ایمان کا اظہار یوں کیا تھا کہ پنجاب کی وکالت کرتے ہوئے اُس حد تک آگے گئے کہ یہ بھی کہہ دیا کہ محترمہ بینظیر کی حفاظت کرتے ہوئے جن نوجوانوں نے اپنے جانیں قربان کیں۔ وہ سارے کے سارے ایسے پنجابی نوجوان تھے جن کو انہوں نے پنجاب کی جیلوں میں اپنی قید کے دوران دوست بنایا تھا۔

آصف زرداری ذاتی طور پر ایک بہادر آدمی ہیں۔ انہوں نے طویل قید کاٹی لیکن اپنی

رہائی کیلئے محترمہ بینظیر کو کسی ایسی مفاہمت پر مجبور نہیں کیا۔ جو پیپلز پارٹی کی سیاست کو درہم برہم کر سکتی ہو یا انہیں ہمیشہ کیلئے سیاسی میدان سے باہر کر دیتی۔ بھٹوز کی طرح آصف زرداری ایک جنگجو انسان ہیں اور میدان میں کھڑا ہو کر لڑنا جانتے ہیں۔ سانحہ لیاقت باغ کے بعد انہوں نے اپنی قائدانہ صلاحیتوں کا اس طرح مظاہرہ کیا کہ اتنے بڑے سانحے کے نتیجے میں ٹوٹنے کے بجائے مزید مضبوط ہو کر ابھرے۔

ذوالفقار علی بھٹو کی ایک نسل کا دور تمام ہوا لیکن ''نئے بھٹوز'' نے ان کا علم زمین پر نہیں گرنے دیا۔ یہ علم بلاول بھٹو زرداری کے سیاست میں آنے تک آصف علی زرداری کے ہاتھ میں آیا ہے اور کئی سال بعد سہی لیکن بالآخر محترمہ بینظیر ہی کی اولاد کو منتقل ہو گا۔ پچھلے 28 سال کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ بھٹوز سیاسی طور پر فنا نہ کیے جا سکیں تو جسمانی طور پر ملیامیٹ کر دیئے جاتے ہیں۔ ''نئے بھٹوز'' نے اس یقین کی بنیاد پر یہ چیلنج قبول کیا ہے کہ

قتل گاہوں سے چن کر ہمارے علم
اور نکلیں گے عشاق کے قافلے

■ ■ ■

5 جنوری 2008ء

محترمہ بینظیر بھٹو کی شہادت کے سلسلے میں صدر پرویز مشرف نے ملین ڈالر کا نکتہ اٹھایا ہے۔ ''دیکھنا ہو گا کہ بینظیر کے قتل سے کس کو فائدہ ہوا'' ہماری پولیس کا روایتی طریقہ یہ ہے، وہ ہر اندھے قتل کی تفتیش پہلے مقتول کے گھر والوں سے شروع کرتی ہے اور پھر محلے داروں پر چڑھائی کر دیتی ہے۔ ہر ایک سے اقبال جرم کرانے کی پوری کوشش کرتی ہے، فوری کامیابی نہ ہو تو فائل اس وقت تک کیلئے بند کر دی جاتی ہے۔ جب تک کوئی ایسا ملزم نہیں پکڑا جاتا جو ناکردہ گناہوں کا اعتراف کرنے کیلئے بھی تیار ہو، مشرف سے پہلے فائدہ والا نکتہ سب سے پہلے سابق وزیراعلیٰ سندھ ارباب غلام رحیم نے

اٹھایا تھا اور وہ یہ بھول گئے تھے کہ محترمہ کے آنے کا سب سے زیادہ نقصان خود انہیں ہوا ہے اور فائدے کے مقابلے میں نقصان زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہے۔

واردات کے اگلے روز وزارت داخلہ کے ترجمان نے ایک ٹیپ شدہ گفتگو کو ثبوت کے طور پر پیش کر کے یہ فیصلہ سنایا کہ محترمہ کو بیت اللہ محسود نے قتل کرایا۔ جس کی تردید یوں آئی کہ ''ہم خواتین کو ہلاک نہیں کرتے''۔ محترمہ الیکشن میں اکثریت حاصل کر کے دہشت گردی کے خلاف جنگ میں حکومت کا حصہ بن جاتیں تو وہ ایک طاقتور صدر کے سائے میں، جو تازہ تازہ فوج سے ریٹائر ہوئے ہیں اور ابھی تک آرمی ہاؤس میں مقیم ہیں، محض ایک نمائشی وزیراعظم ہوتیں۔ اُن کیلئے صدر اور آرمی چیف کے درمیان سینڈوچ بن کر داخلی معاملات پر پوری دسترس حاصل کرنا بھی مشکل ہو جاتا۔ وہ دہشت گردی کے خلاف جنگ میں زیادہ سے زیادہ یہ کردار ادا کر سکتی تھیں کہ امریکیوں کو یہ سمجھانے کی کوشش کرتیں کہ اس جنگ کے جنون میں پاکستان کو مزید تباہ نہ کریں۔ ان کے اس جملے کو بھی بہت اچھالا گیا کہ وہ امریکیوں کو پاکستان کے اندر داخل ہو کر کارروائی کی اجازت دے دیں گی۔ اس جملے کا اصل سیاق و سباق خدا جانے کیا تھا لیکن کیا پاکستان میں صدارت اور فوج کے موجودہ سیٹ اپ میں کوئی وزیراعظم اتنی بڑی ''بغاوت'' کی جرات کر سکتا ہے کہ کسی غیر ملکی فوج کو ملک کے اندر آنے کا ''پرمٹ'' دے دے۔ کیا یہ کوئی ڈیزل کا پرمٹ تھا۔ جس کی پوچھ گچھ یا حساب کتاب کرنے کی نوبت بھی نہیں آتی۔

ایک فائدہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو پہنچا ہے۔ جن تک وہ آئی اے ای اے کو رسائی دینے کا ارادہ رکھتی تھیں۔ لاہور میں اپنی آخری بریفنگ کے دوران ایک سوال کے جواب میں اپنے اس موقف کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا کہ ایٹمی اسلحہ کے پھیلاؤ کی واردات میں ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو قربانی کا بکرا بنایا گیا ہے اور وہ صرف یہ چاہتی ہیں کہ ڈاکٹر صاحب اپنی پوزیشن واضح کر سکیں اور اصل ملزم بے نقاب ہوں۔ اب یہ فیصلہ کرنا ہمارے اختیار میں ہے کہ محترمہ کی شہادت سے ڈاکٹر صاحب کو فائدہ پہنچا ہے یا نقصان۔

محترمہ نے اپنے شہید والد کا معروف نعرہ روٹی، کپڑا اور مکان اپنایا تھا اس لئے یہ بھی ممکن ہے کہ روٹی کپڑے اور مکان کے اجارہ داروں نے اپنے فائدے کیلئے محترمہ سے نجات حاصل کرنا چاہی ہو اور کسی ''خدا رسیدہ استحصالی'' کی کوئی ایسی بددعا قبول ہوگئی ہو کہ حملہ آور کا نشانہ سیدھا ٹارگٹ پر جالگا۔

محترمہ کی شہادت کا ایک فائدہ سندھ کی ان قوتوں کو بھی پہنچا ہے، جو وفاق پاکستان کی مخالف ہیں اور پیپلز پارٹی کی بھٹو قیادت کو اس لئے ناپسند کرتی ہیں کہ وہ جیلیں کاٹتے، پھانسیاں چڑھتے اور قتل ہوتے رہے لیکن علیحدگی پسندوں کا ساتھ دینے کیلئے تیار نہیں ہوئے۔ ذوالفقار علی بھٹو کو پہلے لاہور ہائیکورٹ کے پنجابی ججوں نے سزائے موت سنائی پھر سپریم کورٹ کے صرف پنجابی ججوں نے، جو اکثریت میں تھے، اس کی توثیق کی۔ وہ راولپنڈی کی جیل میں پنجابیوں کے ہاتھوں پھانسی چڑھے۔ اس کے باوجود محترمہ بینظیر نے کبھی پنجاب کو اپنے باپ کے قتل کا ملزم نہیں ٹھہرایا۔

جب بھی یہ سوال اٹھایا جاتا ہے کہ سانحہ لیاقت باغ کا فائدہ کس کو پہنچا۔ مقصد یہی ہوتا ہے کہ شبے کی انگلی آصف علی زرداری کی طرف اٹھائی جاسکے۔ دنیا کو بلاوجہ ظالم نہیں کہا جاتا۔ وہ تو کبھی کبھی ظلم کی انتہا تک بھی چلی جاتی ہے۔ اس دنیا کو خبر ہو کہ محترمہ کی شہادت سے زرداری صاحب کو یہ فائدہ ہوا ہے کہ وہ بینظیر صاحبہ جیسی ایک عظیم الشان خاتون کی رفاقت سے محروم ہوگئے۔ ان کے بچے نوعمری میں ایک ایسی ماں سے جدا ہوگئے، جس کا وجود دنیا بھر میں ان کیلئے باعث فخر تھا۔ محترمہ کی زندگی میں آصف زرداری عملی طور پر پارٹی کے سپر چیئرمین تھے۔ تمام بڑے فیصلے ان کے مشورے سے ہوتے تھے۔ اب ان کا عہدہ کم ہوکر شریک چیئرمین کا رہ گیا ہے اور تمام تر خطرات ان کے گرد جمع ہوگئے ہیں۔ اور کوئی وجہ نہیں کہ جب وہ انتخابی مہم پر نکلیں، وہی عناصر انہیں ٹارگٹ بنانے کی کوشش کریں جنہوں نے بھٹو صاحب کو پھانسی دیکر سندھ میں علیحدگی کے بیج بونے چاہے تھے اور پھر محترمہ پر ملک کی زمین تنگ کرکے پیپلز پارٹی کے وفاقی وجود کو توڑنا چاہا اور اب انہیں شہید کرکے ظاہری طور پر اپنا

مشن مکمل کر لیا ہے۔ آصف زرداری ایک بہادر آدمی ہیں۔ محترمہ کے جنازے اور سوئم میں انہوں نے بڑے حوصلے اور صبر سے صورتحال کا مقابلہ کیا اور غصے کی آگ کے شعلوں میں جلتے ہوئے سندھیوں کے سامنے پنجاب اور پنجابیوں کی خوب وکالت کی لیکن نوڈیرو سے واپس آنے والے لوگوں نے انہیں دروازے بند کر کے بچوں کی طرح روتے ہوئے بھی سنا ہے۔ جانشینی کی تقریب میں بلاول نے بھی اپنے باپ کی طرح صبر اور متانت کا قابل رشک نمونہ پیش کیا لیکن اس کے دل کی حالت اس کی عمر کے وہی بچے محسوس کر سکتے ہیں جنہوں نے اپنی ماں کو اسی طرح بیدردی سے قتل ہوتے دیکھا ہو جس طرح بلاول اور اس کی دونوں بہنوں کو دیکھنا پڑا۔

محترمہ کے خاندان پر ایک قیامت گزر گئی ہے اور سب سے بڑے امتحان کا سامنا آصف علی زرداری کو ہے۔ جنہوں نے بھٹوز کے مشن کی قیادت بھی کرنی ہے اور جن کی اپنی جان بھی ہر وقت خطرے میں رہے گی۔

جس کسی کا خیال ہے کہ محترمہ کی شہادت سے آصف زرداری کو کوئی فائدہ پہنچا ہے، میری دعا ہے کہ خدا اسے ایسے ہی کسی فائدے سے ہمکنار کرے۔

■ ■ ■

20 دسمبر 2009ء

سلطان باہو نے کہا ہے۔

میں قربان اوناں تھیں باہو

قبر جنہاں دی جیوے ہو

ہمارے ملک میں بہت سی قبریں زندہ ہیں لیکن شہادت کی دوسری برسی پر ایک زندہ قبر کی شان ہی بالکل نرالی ہے۔ یہ محترمہ بینظیر بھٹو کی قبر ہے، جن کے خون سے عدلیہ سمیت موجودہ جمہوری سیٹ اپ نے جنم لیا اور جن کی قبر کو ملک کی سب سے بڑی عدالت نے آج

کٹہرے میں لا کھڑا کیا ہے۔ کٹہرا بھی وہ، جس کی روایات اتنی شاندار ہیں کہ ایک طرف ملکی تاریخ کا مقبول ترین لیڈر پھانسی کے تختے پر کھڑا دکھائی دیتا ہے اور دوسری طرف ناقابل معافی جرائم کرنے والے دو فوجی ڈکٹیٹر جنرل ضیاء الحق اور جنرل پرویز مشرف اپنے اپنے ہاتھوں میں یہ سرٹیفکیٹ تھامے نظر آتے ہیں کہ وہ اتنے برحق تھے کہ اپنے طور پر آئین تبدیل کرنے کے مجاز ٹھہرائے گئے۔ عوام کا مینڈیٹ تو آسانی سے روند دیا جاتا ہے لیکن جب بندوق کا مینڈیٹ سامنے کھڑا ہو تو زبان سے سچ نکلتا ہے نہ قلم حق لکھنے کی جرات کرتا ہے؟ کیوں؟ کیا اس لئے کہ ہمارے ملک کا یہ ''سچ'' کبھی تبدیل نہیں ہوتا۔

بنے ہیں اہل ہوس مدعی بھی منصف بھی
کسے وکیل کریں، کس سے منصفی چاہیں
محترمہ بینظیر کس پر قربان ہوئیں؟

اس بے وفا، بے رحم اور بے مروت جمہوریت اور عدل پر؟

سمجھا جاتا ہے کہ وہ سب کچھ جو زندگی کا حصہ ہوتا ہے موت کے بعد بھلا دیا جاتا ہے لیکن ہمارے ملک کی سیاست کی حد تک یہ نقطہ نظر درست نہیں۔ یہاں اصولوں کی سیاست ہوتی ہے، ایسے بے رحم اصولوں کی جو اپنے لئے اور لیکن دوسروں کے لئے بالکل اور ہوتے ہیں۔

ذوالفقار علی بھٹو نے ایک ہارے ہوئے ملک کو نئی زندگی دی۔ محترمہ بینظیر نے اسے جمہوریت واپس دلانے کیلئے اپنی جان نذر کر دی۔ اور ہم ہیں کہ ان کی قبر کا ٹرائل کر رہے ہیں۔ ہم بھی کیا لوگ ہیں۔ کتنے احسان شناس لوگ!

■ ■ ■

5 مئی 2010ء

محترمہ بینظیر بھٹو کی شہادت پر اقوام متحدہ کی رپورٹ آ گئی ہے۔ اصل سوالوں کا جواب تو نہیں ملا لیکن بہت سے نئے سوال اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ پہلا سوال تو یہ ہے کہ سانحہ لیاقت باغ کی تحقیقات اقوام متحدہ کو دینے کا مقصد کیا تھا؟ کیا ہماری پارلیمنٹ اور حکومت کو معلوم نہیں تھا کہ اندھی وارداتوں کی تحقیقاتی رپورٹوں سے سراغ ملتے ہیں نہ کبھی ملزموں کی نشاندہی ہوتی ہے؟ میرا اندازہ ہے کہ پیپلز پارٹی کی قیادت کو یقین تھا کہ ''کھرا'' انہی منصوبہ سازوں تک پہنچ جائے گا جنہوں نے اس بلائنڈ مرڈر کے فول پروف انتظامات کئے اور اپنے آپ کو بری الذمہ بھی ثابت کر دیا۔ جائے واردات پر سکیورٹی کے انتظامات ایک ایسی شخصیت کیلئے تقریباً نہ ہونے کے برابر تھے جن کی زندگی کو یقینی خطرات لاحق تھے۔ سوال یہ ہے کہ بی بی صاحبہ کی گاڑی کو پندرہ بیس گاڑیوں کے حصار میں سڑک پر کیوں نہیں لایا گیا۔ جب حملہ ہوا تو ان کی گاڑی کے اردگرد نہ صرف کوئی سکیورٹی نہیں تھی بلکہ وہ اتنی بے یارو مددگار تھیں کہ ایک پستول بردار ان کی گاڑی کے پچھلے بڈ پر چڑھ کر فائرنگ کرتا رہا۔

اقوام متحدہ کی رپورٹ میں حکومت کو تو ناقص سکیورٹی کا ملزم ضرور ٹھہرایا گیا لیکن ذمہ داری کے حوالے سے کنفیوژن پیدا کرنے کیلئے یہ بھی کہہ دیا گیا کہ بیک اپ کے لئے مخصوص ایک کالی گاڑی، محترمہ کی گاڑی کے پیچھے موجود نہیں تھی، مذکورہ گاڑی کی واحد خصوصیت یہ تھی کہ اس کے اندر اہم پارٹی رہنما رحمان ملک، بابر اعوان، جنرل (ر) توقیر ضیا اور فرحت اللہ بابر بیٹھے ہوئے تھے۔ گاڑی کے ڈرائیور کا نام خضر حیات تھا تاہم اصل اہمیت وزیر داخلہ رحمان ملک اور وزیر قانون ڈاکٹر بابر اعوان کو دی جا رہی ہے اور اس طرح کا کوئی تاثر پیدا کرنے کی دانستہ کوشش ہو رہی ہے کہ ان کی گاڑی محترمہ کی گاڑی کے پیچھے موجود ہوتی تو اگلی گاڑی بچ سکتی تھی۔

الیکٹرانک میڈیا کے ایک کٹہرے میں ڈرائیور خضر حیات پر ایک طویل جرح کے دوران بار بار اس بات پر زور دیا گیا کہ فائرنگ اور بم دھماکے کے بعد یہ چار سوار بی بی صاحبہ

کی خیریت معلوم کرنے کیلئے گاڑی سے باہر کیوں نہیں نکلے۔ خضر حیات نے ایک سے زیادہ مرتبہ وضاحت کی کہ افراتفری کے اس عالم میں پولیس کی ایک گاڑی ہمارے آگے تھی اور ہمیں کہہ رہی تھی کہ آگے نکلو، پیچھے دھواں ہی دھواں تھا۔ رحمان ملک اور ان کے ساتھی بار بار فون کرکے بی بی صاحبہ کی خیریت معلوم کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ دوسری طرف کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا۔ وہ گاڑی سے اتر کر دھوئیں میں گھس سکتے تھے یا بھگدڑ میں شامل ہو کر اپنے آپ پر یہ فردِ جرم لگوا سکتے تھے کہ فائرنگ اور دھماکے کی آواز سن کر گاڑی سے اترے اور جانیں بچانے کیلئے اندھا دھند بھاگ اٹھے۔ خضر حیات کے بقول اس نے محترمہ کی گاڑی کے پیچھے چلنے والی ڈبل کیبن کے ڈرائیور سے فون پر رابطہ کیا جس کا جواب یہ تھا کہ مجھے بی بی کا کچھ پتہ نہیں۔ بی بی صاحبہ کا ڈرائیور اس کا حقیقی بھائی ہے۔ خضر حیات نے فون ملایا تو اس نے بتایا کہ بی بی صاحبہ زخمی تھیں اور ہماری گاڑی آگے نہیں جا سکتی تھی ہم نے انہیں کسی اور گاڑی میں منتقل کر دیا۔ جونہی یہ خبر رحمان ملک صاحب کو ملی تو انہوں نے کہا کہ گاڑی کو جتنا بھی تیز چلا سکتے ہو چلاؤ اور ہسپتال پہنچو۔ خضر حیات نے یہ بھی بتایا کہ اس کی گاڑی بیک اپ کیلئے نہیں بلکہ متبادل گاڑی کے طور پر استعمال ہوتی تھی۔ ہم کبھی آگے اور کبھی پیچھے چلا کرتے تھے تاہم دونوں گاڑیاں ہمیشہ ساتھ ساتھ (اسے آس پاس بھی کہا جا سکتا ہے) رہتی تھیں...... اس بیان سے ساری حقیقت سامنے آ جاتی ہے لیکن اس ملین ڈالر سوال کا جواب نہیں ملتا کہ اس کار میں سوار لیڈر محترمہ کی خیریت معلوم کرنے کیلئے گاڑی سے باہر کیوں نہیں نکلے؟ کیا یہ خیریت دھوئیں کے پیچھے چھپی ہوئی تھی یا سڑک کے کنارے کھڑی تھی؟ محترمہ کا اپنا ڈرائیور اس کے سوا کچھ نہیں جانتا تھا کہ وہ زخمی تھیں اور ان کی گاڑی کے پیچھے چلنے والی ڈبل کیبن کا ڈرائیور صورتحال سے بالکل لاعلم تھا۔ گاڑی کے اندر رحمان ملک، بابر اعوان اور باقی دونوں حضرات اس کے سوا اور کر بھی کیا سکتے تھے کہ گاڑی کو کسی ایسی جگہ تک لے جائیں جہاں سے رابطہ کرکے حقیقت حال معلوم ہو سکے۔ خضر حیات نے یہ بھی کہا ہے کہ افسوس ہے کہ مجھے گاڑی کے ساتھ رہنا چاہیے تھا لیکن میں آگے نکل گیا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ محترمہ بینظیر جلسے سے

واپسی پر گاڑی تبدیل کر لیا کرتی تھیں لیکن اس روز ایسا نہیں کیا۔ اس سے اہم بات یہ ہے کہ خضر حیات کے مطابق جب بی بی صاحبہ کن روف سے باہر نکلیں تو رحمان ملک نے کہا کہ ہم یہاں سے بخیریت نکل جائیں تو معجزہ ہوگا کیونکہ سکیورٹی نہیں ہے اور بی بی گاڑی سے باہر نکل آئی ہیں"۔ سکیورٹی کس کی ذمہ داری تھی، حکومت کی، لیکن اقوام متحدہ کی، رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ پارٹی کی سکیورٹی بھی مناسب نہیں تھی۔ اس نکتے کی منطق سمجھ سے باہر ہے۔ کیا رپورٹ لکھنے والے یہ کہنا چاہتے ہیں کہ پیپلز پارٹی کے نہتے کارکنوں اور لیڈروں نے کوئی باضابطہ سکیورٹی تنظیم بنا رکھی تھی اور رحمان ملک اس کے سربراہ تھے اس لئے انہیں کٹہرے میں کھڑا کرنا ضروری ہے۔

رحمان ملک یقیناً "بے گناہ" نہیں، ان کے جرائم کی فہرست خاصی طویل ہے۔ دہشت گردی کے عفریت کی موجودگی میں انہیں وزارت داخلہ ملی۔ وہ جان کی پروا کئے بغیر ہر بم دھماکے کے بعد موقع پر پہنچتے رہے۔ کراچی کے فسادات ہوں یا جہلم سے برطانوی بچے کا اغوا یا کوئی بھی دوسرا مشکل معاملہ، وہ کسی کام میں ہاتھ ڈالنے سے گریز نہیں کرتے۔ انہیں حکم چلانا بھی آتا ہے اور منوانا بھی۔ خرابی صرف یہ ہے کہ میڈیا کا ایک مخصوص حصہ انہیں پسند نہیں کرتا، یہی معاملہ بابر اعوان کا ہے۔

■ ■ ■

21 جون 2009ء

محترمہ بینظیر بھٹو زندہ ہوتیں تو آج اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ 56 ویں سالگرہ منا رہی ہوتیں۔ پورے ملک میں پیپلز پارٹی کے لیڈر اور کارکن کیک کاٹ رہے ہوتے اور خوشی کی تقریبات کے ساتھ یہ غم منسلک نہ ہوتا کہ 27 دسمبر 2007ء کو وہ ایک خوفناک سازش کا شکار ہو کر شہید ہو گئی تھیں۔ محترمہ بہت بڑی لیڈر تھیں۔ ان کی یاد کے ساتھ کوئی تنازعہ بھی وابستہ نہیں ہے۔ پاکستان 14 اگست 1947ء کو

وجود میں آیا۔ قائداعظم 11 ستمبر 1948ء کو وفات پا گئے۔ لیاقت علی خان کو 16 اکتوبر 1951ء کو لیاقت باغ راولپنڈی میں گولی مار کر شہید کیا گیا۔ قاتل کو موقع پر ہی ہلاک کر دیا گیا۔ سازش کیا تھی؟ سازشی کون تھے؟ کوئی سراغ نہیں ملا۔ لیاقت علی خان اور محترمہ بینظیر بھٹو راولپنڈی کے ایک ہی مقام پر شہید ہوئے اور اتفاق سے تھوڑے بہت فرق کے ساتھ دونوں کی عمریں بھی پچپن پچپن سال تھیں۔ لیاقت علی خان کی طرح محترمہ کے اصل قاتلوں اور اصل سازش کا بھی شاید کبھی پتہ نہ چل سکے۔ مشرف حکومت نے بیت اللہ محسود کو مرکزی ملزم قرار دیکر، کچھ افراد کو گرفتار کیا تھا۔ یہ مقدمہ ابھی تک درمیان میں لٹکا ہوا ہے۔ محترمہ کی شہادت کا تعلق یقیناً دہشت گردی اور دہشت گردوں سے تھا لیکن اس سازش میں صرف وہ نہیں تھے۔ کچھ نادیدہ طاقتیں ان کے ساتھ شامل تھیں۔ جن کے بارے میں اندازے تو لگائے جا سکتے ہیں لیکن قطعی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ میرا خیال ہے اس سازش کی تفصیل بھی کبھی معلوم نہیں ہو سکے گی۔

قائداعظم اپنی وفات اور لیاقت علی خان اپنی شہادت تک (تھوڑے سے فرق کے ساتھ) غیر متنازعہ تھے۔ محترمہ بینظیر اپنی شہادت کے بعد غیر متنازعہ ہوئیں۔ اسلام آباد ائرپورٹ پر لینڈنگ سے پہلے جب ہوائی جہاز کا پائلٹ یہ اعلان کرتا ہے کہ ''تھوڑی دیر میں ہم بینظیر بھٹو ائرپورٹ پر اترنے والے ہیں'' تو یہ سوچ کر بڑا دکھ ہوتا ہے کہ ہم ایک غیر متنازعہ قومی لیڈر سے محروم ہو گئے۔ محترمہ کی غیر متنازعہ حیثیت کا تعلق ان کی ذات سے نہیں اس المناک شہادت سے ہے جو انہیں لیاقت باغ میں زندگی کی آخری تقریر کے بعد نصیب ہوئی۔ محترمہ بینظیر زندہ رہتیں اور پنجاب میں انتخابی مہم پوری کر لیتیں تو بھی پیپلز پارٹی کچھ کم یا زیادہ نشستیں لیکر کامیاب ہو جاتی اور اسے اسی طرح کا اقتدار مل جاتا جو 18 فروری 2008ء کے انتخابات میں ملا۔ پھر انہیں وہی حالات پیش آتے جن کا ان کی شہادت کے بعد آصف علی زرداری کو سامنا کرنا پڑا۔ تیسری مرتبہ وزیراعظم بننے پر پابندی کی وجہ سے شاید انہیں بھی اپنی پارلیمانی پارٹی کے کسی دوسرے رکن کو وزیراعظم بنانا پڑتا اور بعد میں وزیراعظم تبدیل کرنے

کے بجائے خود صدر کا عہدہ سنبھالنا پڑ جاتا۔ یہ قیاس آرائی بڑی مشکل ہے کہ عدلیہ کی بحالی کا مسئلہ وہ کیسے طے کرتیں اور مسلم لیگ (ن) کے ساتھ مخلوط حکومت برقرار رکھنے کیلئے کیا کیا جتن کرتیں۔ لیکن اس ملک کے سیاسی کلچر کے پیش نظر میرا اندازہ ہے کہ وہ بھی اسی طرح ہدف تنقید بن جاتیں جس طرح آصف زرداری بنے ہوئے ہیں۔ صدر بن جاتیں تو اختیارات کا جھگڑا اٹھتا اور کسی دوسرے کو وزیراعظم بنا دیتیں تو اسے ہٹا کر خود وزیراعظم بننا مشکل ہو جاتا۔

4 اپریل 1979ء کو ذوالفقار علی بھٹو کی شہادت کے بعد، جب بینظیر صاحبہ عملی سیاست میں آئی تھیں۔ انہیں باپ کے ورثے میں وہ سیاسی مخالفت بھی ملی تھی۔ جس کی بنیاد یہ ہے کہ پیپلز پارٹی کا اقتدار کسی قیمت پر قبول نہیں۔ 1988ء کے الیکشن کے بعد صدر غلام اسحاق خان اور 1993ء کے الیکشن کے بعد صدر فاروق لغاری نے ان کی حکومت برطرف کی۔ محترمہ اور آصف زرداری کے خلاف کرپشن کے ایک درجن سے زائد مقدمے بنائے گئے۔ ایک مقدمے میں انہیں سزائے قید بھی سنائی گئی۔ وہ جیل جانے سے اس لئے بچ گئیں کہ ایک دن پہلے ملک سے باہر چلی گئی تھیں۔ جلاوطنی کے دوران انہوں نے اپنے ہمدرد ملکوں امریکہ، برطانیہ اور متحدہ عرب امارات کے ذریعے سابق صدر پرویز مشرف سے بالواسطہ اور براہ راست مذاکرات کیے جن کے نتیجے میں قومی مفاہمتی آرڈیننس (این آر او) جاری ہوا۔ سکیورٹی خدشات کو نظر انداز کر کے وہ وطن واپس آ گئیں۔ کراچی میں خودکش بمبار سے بچ نکلیں لیکن لیاقت باغ میں سازش اتنی جامع تھی کہ وہ شدید زخمی ہو کر ہسپتال پہنچنے سے پہلے ہی دم توڑ گئیں۔

محترمہ زندہ ہوتیں اور اقتدار میں آ جاتیں تو آج آصف زرداری کے بجائے این آر او کے طعنوں کی بوچھاڑ ان پر ہو رہی ہوتی۔ ہر الزام ان کے حصے میں آتا اور ہر غلط ”کام“ دوسرے لوگ کرتے۔ وہ تمام ای میلوں اور ایس ایم ایسز کا موضوع ہوتیں جو پچھلے کئی ماہ سے صدر آصف زرداری پر برس رہے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ پنجاب کے ایک جونیئر بیوروکریٹ کو فرانس میں پاکستان کا سفیر کوئی اور مقرر کرتا اور طلعت حسین جیسے باخبر صحافی ہدف ملامت

محترمہ بینظیر کو بنا رہے ہوتے۔ قصہ مختصر یہ سب کچھ ایسے ہی ہوتا، جیسے اب نظر آ رہا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ پیپلز پارٹی کا سربراہ خواہ ذوالفقار علی بھٹو ہو، محترمہ بینظیر بھٹو یا آصف علی زرداری، اسے ٹارگٹ بنائے بغیر اس پارٹی کے مخالف اپنے اصل مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ یہ سلسلہ 1966ء میں پیپلز پارٹی کے قیام کے ساتھ شروع ہوا تھا اور اس کا اختتام اس وقت تک ممکن نہیں جب تک پیپلز پارٹی اپنے فیصلہ کن ووٹ بنک کے ساتھ سیاست میں موجود ہے۔ شہادت نے محترمہ کو تاریخ میں لافانی زندگی دے دی۔ اگر زندگی کے مقابلے میں تاریخ کے صفحات پر سنہرے الفاظ میں لکھا ہوا نام زیادہ قیمتی ہوتا ہے تو بے وقت اور بے رحم موت کا نشانہ بننے والی محترمہ بینظیر بھٹو کو اپنی 56 ویں سالگرہ مبارک ہو۔

■ ■ ■

23جون 2010ء

محترمہ بینظیر بھٹو کی ہر سالگرہ اور ہر برسی پر یہ سوال اٹھتا رہے گا کہ عام انتخابات کے بعد پیپلز پارٹی کو حکومت مل گئی، اس کے باوجود قاتل کیوں نہیں پکڑے گئے؟ پیپلز پارٹی کے وفادار بھی اس مسئلے پر سنجیدہ ہیں اور ناراض گروپ خصوصاً ناہید خان صاحبہ اور صفدر عباسی اس طرح کا تاثر دینے میں سب سے آگے ہیں جیسے سانحہ راولپنڈی کے مجرم بالکل سامنے کھلے پھر رہے ہوں اور حکومت نے اپنی آنکھیں بند کر رکھی ہوں۔ آج اس جذباتی لہر کا رخ صدر آصف زرداری کی طرف ہے، کل بلاول بھٹو زرداری کی طرف ہوگا اور کوئی بعید نہیں کہ ناہید خان صاحبہ اس وقت بھی محترمہ کی کسی سالگرہ پر الگ تقریب منعقد کریں جس میں احتجاجاً کیک نہ کاٹا جائے اور ایسا ہی کوئی اعلان دہرایا جائے کہ ''بینظیر کے قاتلوں کو انجام تک پہنچانا، انصاف ہے، انتقام نہیں۔ ان کے خون کو مفاہمت کے نام پر بھلانے کی اجازت نہیں دی جائے گی''۔

دنیا میں قومی یا بین الاقوامی سطح کے لیڈروں کے اندھے قتل ہمیشہ کسی نہ کسی بڑی سازش

کا شاخسانہ ہوتے ہیں اور عام طور پر ہر سازش کے ان کرداروں کو ''تلف'' کر دیا جاتا ہے جن کی مدد سے تفتیش کا سرا پکڑ کر ماسٹر مائنڈ تک پہنچا جا سکتا ہو۔ امریکہ جیسے ملک میں صدر جان ایف کینیڈی کے قتل کی سازش ہوئی۔ لی ہاروے اوسوالڈ نامی ایک شخص کو اس رائفل سمیت گرفتار کیا گیا جس سے گولی چلائی گئی تھی۔ اوسوالڈ کو عدالت میں پیش کرنے کیلئے لایا گیا جہاں جان ایف کینیڈی کے ایک ''عاشق'' جیک روبی نے اسے گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ جیک روبی کو سزائے موت سنائی گئی، ابھی اس کی اپیل کی تاریخ بھی نہیں نکلی تھی کہ وہ جیل میں کینسر سے مر گیا۔ قصہ ختم...... اس قتل پر کتابیں لکھی گئیں جن میں الزام لگایا گیا تھا کہ کینیڈی کو امریکی سی آئی اے نے قتل کرایا ہے، یہ کسی ایک آدمی کا کام نہیں یقیناً کسی بڑی سازش کا حصہ تھا۔ واردات کا پہلا سرا اوسوالڈ سمیت ''تلف'' ہو گیا، کتابیں باقی ہیں، جن میں چھپی ہوئی معلومات اور قیاس آرائیاں پڑھ کر کنفیوژن کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ پھر جان کینیڈی کے چھوٹے بھائی رابرٹ کینیڈی کو صدارت کی انتخابی مہم کے دوران گولی مار کر ہلاک کیا گیا۔ گولی مارنے والے فلسطینی تارک وطن کو جیل بھیج دیا گیا۔ بات ختم ہو گئی۔ یکے بعد دیگرے دو بھائیوں کے قتل کے پیچھے کون تھا؟ مختلف نوعیت کی سازش تھیوریوں کے درمیان کوئی ٹھوس حقیقت سامنے نہیں آئی۔ جان ایف کینیڈی کے قتل کے بعد نائب صدر جانسن نے صدارت سنبھالی۔ چیف جسٹس ارل وارن کی سربراہی میں ایک تحقیقاتی کمشن بنایا گیا جس نے قرار دیا کہ اکیلا اوسوالڈ قاتل تھا۔ گویا یکے بعد دیگرے دو اکیلے اکیلے آدمیوں نے ایک بھائی کو اس کے دور صدارت میں اور دوسرے کو صدارتی انتخاب کی مہم کے دوران ایسی صورتحال میں قتل کر دیا جب وہ یقینی طور پر جیتتا نظر آ رہا تھا۔

محترمہ بینظیر بھٹو کے قتل کی سازش کا جائزہ لیا جائے تو اسے دنیا میں اپنی مثال آپ ہی کہا جا سکتا ہے۔ اس کے مندرجہ ذیل پہلو خاص طور پر غور طلب ہیں۔ (1) کوئی غیبی طاقت محترمہ بینظیر بھٹو کو بار بار خبردار کرتی رہی کہ پاکستان واپسی کی صورت میں ان کی جان خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ واشنگٹن سے دبئی روانگی کے وقت ایک چھوٹی سی مجلس میں انہوں نے کہا کہ

''ممکن ہے یہ میرا آخری دورہ ہو'' پھر گڑھی خدا بخش کے قبرستان میں بھٹو صاحب کی قبر کے ساتھ اپنی جگہ کی نشاندہی کی۔ (2) تین دوست ممالک کے سربراہوں نے انہیں خطرے سے آگاہ کیا۔ (3) جنرل (ر) پرویز مشرف نے انہیں فول پروف سکیورٹی دینے کے عوض یہ شرط رکھی کہ وہ ان کے ساتھ تعاون کرینگی یعنی مل کر حکومت بنائیں گی۔ محترمہ نے انکار کر دیا۔ (4) دہشت گردی کی کھلی مخالف ہونے کے سبب وہ القاعدہ اور طالبان کی ہٹ لسٹ پر بھی تھیں۔

18 اکتوبر 2007ء کو کراچی میں خودکش دھماکے میں بال بال بچ جانے کے باوجود انہوں نے انتخابی جلسوں کا سلسلہ جاری رکھا۔ لیاقت باغ کے جلسے کے بعد، ان پر آخری حملے کی فوٹیج دیکھی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ گاڑی کی ڈگی پر چڑھے ہوئے پستول بردار سمیت ایک سے زیادہ حملہ آور انہیں نشانہ بنانے پر مامور تھے اور جو کوئی بھی سازش کا ماسٹر مائنڈ تھا اس نے طے کر رکھا تھا کہ انہیں لیاقت باغ سے زندہ نہیں جانے دینا۔ حکومت کے سکیورٹی انتظامات تقریباً نہ ہونے کے برابر تھے حالانکہ ایک اہم شخصیت ایک رات پہلے محترمہ کو خبردار کر چکی تھی کہ لیاقت باغ کے جلسے میں جانا ان کی جان کیلئے خطرناک ہوگا۔

خطرے سے آگاہ ہونے کے باوجود حکومت نے انہیں فول پروف سکیورٹی نہیں دی۔ نعش کا پوسٹ مارٹم کرائے بغیر مشرف حکومت کی وزارت داخلہ کے ترجمان بریگیڈئر (ر) جاوید اقبال چیمہ نے پریس کانفرنس کر کے یہ فیصلہ سنا دیا کہ خودکش دھماکے کے بعد محترمہ کا سر گاڑی کے سن روف سے ٹکرا گیا تھا جس سے ان کی موت واقع ہوگئی۔ غسل دیتے وقت محترمہ کی گردن پر گولی کا نشان دیکھا گیا جس پر شاید اس لئے کوئی توجہ نہیں دی گئی کہ اس نقطہ نظر کو تسلیم کرنے کی صورت میں حکومت کو یہ بھی بتانا پڑتا کہ لیاقت باغ کے آس پاس یا پیچھے والی عمارتوں پر سکیورٹی کے انتظامات کس کے ذمے تھے اور ان میں کون کون موجود تھا۔

یہ معمہ ابھی تک حل نہیں ہو سکا کہ جائے وقوعہ کو دھلوانے کا حکم کس نے جاری کیا۔ جنرل (ر) پرویز مشرف پر ناکام حملے کے بعد کئی دن تک جائے وقوعہ اور اس کے اردگرد کے

سارے علاقے پر پہرہ بیٹھا رہا تھا تا کہ کسی قسم کا کوئی سراغ یا نشان ڈھونڈا جا سکے جو تفتیش کو آگے بڑھانے میں کام آ جائے۔ لیاقت باغ والی جائے واردات دھونے میں کیا جلدی تھی؟

پوری تصویر کچھ اس طرح ہے کہ حکومت کو محترمہ بینظیر کی جان بچانے میں کوئی دلچسپی تھی نہ وہ ان کے قتل کی تفتیش میں سنجیدہ تھی۔ خودکش بمبار کی حد تک یہ مانا جا سکتا ہے کہ وہ جنوبی وزیرستان سے آیا ہو اور بیت اللہ محسود نے بھیجا ہو۔ یہ تھیوری کہ طالبان، خواتین کو قتل نہیں کرتے اس لئے غلط ہے کہ وہ تو مارکیٹوں میں ماؤں کے ساتھ شاپنگ کے لئے آنے والے بچوں کو بھی معاف نہیں کرتے۔

مطالبہ بظاہر بالکل سادہ ہے ''محترمہ بینظیر بھٹو کے قاتل گرفتار کئے جائیں لیکن'' قاتل کون ہیں؟ خود محترمہ کے ان ساتھیوں کو بھی علم نہیں جو گاڑی کے اندر موجود تھے اور جس کے سامنے ایک ہجوم نے محترمہ کو سن روف سے سر باہر نکال کر نعروں کا جواب دینے پر مجبور کیا، یہ سارا ہجوم جیالوں کا تھا یا اس کے اندر بھی سازش کرنے والوں کے کچھ کارندے موجود تھے؟

ایک کردار، وہ شخص تھا جس نے خودکش دھماکہ کیا۔ دوسرا وہ ہوسکتا ہے جس نے عقبی بلڈنگ سے گولی چلائی۔ ایک موقع پر ''تلف'' ہو گیا، دوسرے کو سازشوں کے بنیادی اصول کے تحت ''نابود'' کر دیا گیا ہوگا۔ جنرل (ر) پرویز مشرف نے احتیاطاً ایک ایف آئی آر درج کروا کے قتل کے پانچ چھ ملزم بھی گرفتار کروا لئے تھے۔ جنہوں نے اقبال جرم بھی کر لیا تھا۔

اصل قاتل کون تھا؟ ایک تھا یا ایک سے زیادہ۔ یہ راز جاننے والا یا والے موقع واردات پر ہی مر گئے یا فوراً مار دیئے گئے ہوں گے۔

قاتل ابھی تک کیوں گرفتار نہیں کئے گئے؟ سوال زندہ ہے اور زندہ رہے گا۔ جواب 27 دسمبر کی رات کے اندھیرے میں ہمیشہ کیلئے کھو گیا تھا۔ بہرحال تفتیش اور تلاش جاری ہے۔

■ ■ ■

"ممکن ہے یہ میرا آخری دورہ ہو" پھر گڑھی خدا بخش کے قبرستان میں بھٹو صاحب کی قبر کے ساتھ اپنی جگہ کی نشاندہی کی۔ (2) تین دوست ممالک کے سربراہوں نے انہیں خطرے سے آگاہ کیا۔ (3) جنرل (ر) پرویز مشرف نے انہیں فول پروف سکیورٹی دینے کے عوض یہ شرط رکھی کہ وہ ان کے ساتھ تعاون کرینگی یعنی مل کر حکومت بنائیں گی۔ محترمہ نے انکار کر دیا۔ (4) دہشت گردی کی کھلی مخالف ہونے کے سبب وہ القاعدہ اور طالبان کی ہٹ لسٹ پر بھی تھیں۔

18 اکتوبر 2007ء کو کراچی میں خودکش دھماکے میں بال بال بچ جانے کے باوجود انہوں نے انتخابی جلسوں کا سلسلہ جاری رکھا۔ لیاقت باغ کے جلسے کے بعد، ان پر آخری حملے کی فوٹیج دیکھی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ گاڑی کی ڈگی پر چڑھے ہوئے پستول بردار سمیت ایک سے زیادہ حملہ آور انہیں نشانہ بنانے پر مامور تھے اور جو کوئی بھی سازش کا ماسٹر مائنڈ تھا اس نے طے کر رکھا تھا کہ انہیں لیاقت باغ سے زندہ نہیں جانے دینا۔ حکومت کے سکیورٹی انتظامات تقریباً نہ ہونے کے برابر تھے حالانکہ ایک اہم شخصیت ایک رات پہلے محترمہ کو خبردار کر چکی تھی کہ لیاقت باغ کے جلسے میں جانا ان کی جان کیلئے خطرناک ہوگا۔

خطرے سے آگاہ ہونے کے باوجود حکومت نے انہیں فول پروف سکیورٹی نہیں دی۔ نعش کا پوسٹ مارٹم کرائے بغیر مشرف حکومت کی وزارت داخلہ کے ترجمان بریگیڈیئر (ر) جاوید اقبال چیمہ نے پریس کانفرنس کر کے یہ فیصلہ سنا دیا کہ خودکش دھماکے کے بعد محترمہ کا سر گاڑی کے سن روف سے ٹکرا گیا تھا جس سے ان کی موت واقع ہوگئی۔ غسل دیتے وقت محترمہ کی گردن پر گولی کا نشان دیکھا گیا جس پر شاید اس لئے کوئی توجہ نہیں دی گئی کہ اس نقطہ نظر کو تسلیم کرنے کی صورت میں حکومت کو یہ بھی بتانا پڑتا کہ لیاقت باغ کے آس پاس یا پیچھے والی عمارتوں پر سکیورٹی کے انتظامات کس کے ذمے تھے اور ان میں کون کون موجود تھا۔

یہ معمہ ابھی تک حل نہیں ہو سکا کہ جائے وقوعہ کو دھلوانے کا حکم کس نے جاری کیا۔ جنرل (ر) پرویز مشرف پر ناکام حملے کے بعد کئی دن تک جائے وقوعہ اور اس کے اردگرد کے

سارے علاقے پر پہرہ بیٹھا رہا تھا تا کہ کسی قسم کا کوئی سراغ یا نشان ڈھونڈا جاسکے جو تفتیش کو آگے بڑھانے میں کام آ جائے۔ لیاقت باغ والی جائے واردات دھونے میں کیا جلدی تھی؟

پوری تصویر کچھ اس طرح ہے کہ حکومت کو محترمہ بینظیر کی جان بچانے میں کوئی دلچسپی تھی نہ وہ ان کے قتل کی تفتیش میں سنجیدہ تھی۔ خودکش بمبار کی حد تک یہ مانا جا سکتا ہے کہ وہ جنوبی وزیرستان سے آیا ہو اور بیت اللہ محسود نے بھیجا ہو۔ یہ تھیوری کہ طالبان، خواتین کو قتل نہیں کرتے اس لئے غلط ہے کہ وہ تو مارکیٹوں میں ماؤں کے ساتھ شاپنگ کے لئے آنے والے بچوں کو بھی معاف نہیں کرتے۔

مطالبہ بظاہر بالکل سادہ ہے ''محترمہ بینظیر بھٹو کے قاتل گرفتار کیے جائیں لیکن'' قاتل کون ہیں؟ خود محترمہ کے ان ساتھیوں کو بھی علم نہیں جو گاڑی کے اندر موجود تھے اور جس کے سامنے ایک ہجوم نے محترمہ کو سن روف سے سر باہر نکال کر نعروں کا جواب دینے پر مجبور کیا، یہ سارا ہجوم جیالوں کا تھا یا اس کے اندر بھی سازش کرنے والوں کے کچھ کارندے موجود تھے؟

ایک کردار، وہ شخص تھا جس نے خودکش دھماکہ کیا۔ دوسرا وہ ہوسکتا ہے جس نے عقبی بلڈنگ سے گولی چلائی۔ ایک موقع پر ''تلف'' ہو گیا، دوسرے کو سازشوں کے بنیادی اصول کے تحت ''نابوذ'' کر دیا گیا ہو گا۔ جنرل (ر) پرویز مشرف نے احتیاطاً ایک ایف آئی آر درج کروا کے قتل کے پانچ چھ ملزم بھی گرفتار کروا لئے تھے۔ جنہوں نے اقبال جرم بھی کر لیا تھا۔

اصل قاتل کون تھا؟ ایک تھا یا ایک سے زیادہ۔ یہ راز جاننے والا یا والے موقع واردات پر ہی مر گئے یا فوراً مار دیئے گئے ہوں گے۔

قاتل ابھی تک کیوں گرفتار نہیں کیے گئے؟ سوال زندہ ہے اور زندہ رہے گا۔ جواب۔ 27 دسمبر کی رات کے اندھیرے میں ہمیشہ کیلئے کھو گیا تھا۔ بہرحال تفتیش اور تلاش جاری ہے۔

■ ■ ■

4 اپریل 1979ء

17 اپریل 2009ء

4 اپریل 1979ء اور 4 اپریل 2009ء کے درمیان پورے 30 سال کا فاصلہ ہے۔ تیس سال پہلے میڈیا پیپلز پارٹی کے بانی چیئرمین اور ملکی تاریخ کے مقبول ترین سیاسی لیڈر ذوالفقار علی بھٹو کو ایک قتل کیس کا بڑا ملزم قرار دیتا تھا جو جنرل ضیاء الحق نے ان کے عدالتی قتل کیلئے بنوایا تھا، یہ میڈیا اُن پر ملک توڑنے سے لیکر جمہوریت کو پامال کرنے تک ہر قسم کے الزامات لگاتا تھا۔ بہتان تراشی اور سفاکی کی ایک نئی تاریخ رقم جو ہو رہی تھی۔ پیپلز پارٹی کے اپنے اخبار مساوات کے سوا کسی اخبار میں بھٹو صاحب کے حق میں کوئی لفظ لکھا گیا، نہ پیپلز پارٹی کے سوا کسی سیاسی جماعت کا کوئی لیڈر یا کارکن اس خون ناحق کے خلاف بولا۔ دوسری طرف بھٹو صاحب کیلئے شاعروں نے سینکڑوں نظمیں لکھیں۔ وہ افسانوں اور ناولوں کا موضوع بھی بنے لیکن پاکستان ٹیلی ویژن پر مارشل لاء حکومت کا قبضہ تھا اور پرنٹ میڈیا دشمنی کی حد تک متعصب تھا اس لئے بھٹو صاحب کی مظلومیت قومی سچ نہیں بن پائی۔ درمیان میں اس قومی سچ پر آنکھیں بند کرنے کا ایک ایسا مرحلہ بھی آیا کہ راولپنڈی جیل میں بھٹو صاحب کی نگرانی پر مامور کرنل رفیع الدین نے جب جنرل ضیاء الحق سے ایک ملاقات میں ارادہ ظاہر کیا کہ وہ اس موضوع پر ایک کتاب لکھنا چاہتے ہیں تو جنرل صاحب نے بہت برا منایا اور کچھ اس طرح کا جواب دیا کہ ”تم کس وہم میں پڑے ہو، اسے تو اس کے گھر والے بھی بھول چکے ہیں“۔ حالانکہ بھٹو اس وقت بھی اپنی قبر میں زندہ تھا اور وہاں سے عوام کی اکثریت کے دلوں پر حکمرانی کر رہا تھا۔

1988ء میں جنرل ضیاء الحق ہوائی حادثے کی نذر ہو گئے۔ جنرل اسلم بیگ نے اقتدار سنبھالنے کی بجائے انتخابات کروانے کو ترجیح دی تو ذوالفقار علی بھٹو کا عوامی کرشمہ ایک بار پھر منظر عام پر آیا اور پیپلز پارٹی سب سے زیادہ نشستیں جیت کر حکومتی پارٹی بن گئی۔ وزیراعظم بننے کے بعد قوم سے پہلے خطاب کے موقع پر محترمہ بینظیر بھٹو نے سٹوڈیو میں قائداعظم محمد علی جناح کی تصویر کے نیچے بھٹو صاحب کی تصویر بھی آویزاں کرائی تھی لیکن اس ''جسارت'' پر اتنا واویلا مچا کہ پیپلز پارٹی کی قیادت مدافعانہ رویہ اختیار کرنے پر مجبور ہو گئی۔ حالانکہ ذوالفقار علی بھٹو کی یاد اپنے طور پر اتنا بڑا سیاسی سرمایہ ہے کہ پیپلز پارٹی اسے مزید کئی عشرے استعمال کر سکتی ہے۔ جلسہ گاہوں میں ''زندہ ہے بھٹو زندہ ہے'' کے نعرے ضرور گونجتے رہے لیکن پیپلز پارٹی نے اپنے وجود کی اس غیر فانی علامت کو میڈیا کے ذریعے اس نسل سے متعارف نہیں کرایا جس نے 1979ء میں اپنے بڑوں سے بھٹو صاحب کا نام اور انہیں پھانسی دینے کے سانحہ پر متضاد تبصرے سنے تھے۔ بعد میں آنے والی نسل تو بھٹو صاحب سے بالکل ناواقف رہی اور اسے معلوم نہیں ہو سکا کہ 4 اپریل 1979ء کو اس ملک نے مسلمانوں کی تاریخ کی اتنی بڑی شخصیت کو کھو دیا تھا جو مزید 5 سال یا زیادہ عرصہ اقتدار میں رہ جاتی تو پاکستان کیا سے کیا بن چکا ہوتا۔

3 اور 4 اپریل 1979ء کی درمیانی رات کو میں حسین نقی، خالد چودھری اور ملک شاہ محمد محسن مرحوم کا صاحبزادہ شوکت محسن کیمپ جیل کی ایک کوٹھڑی میں قید تھے۔ اس دور کے انگریزی اخبار ''مارننگ نیوز'' کے لاہور کے بیورو چیف چودھری غلام حسین کی ایک خبر اور کیمپ جیل کے ایک اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ امان اللہ کے ذریعے مجھے دوپہر کو ہی پتہ چل گیا تھا کہ یہ بھٹو صاحب کی آخری رات ہے۔ اس دن اور اس سے پہلے میں کیمپ جیل کا واحد باشندہ تھا جو پیپلز پارٹی والوں اور اپنے ساتھیوں سے مسلسل یہ بحث کرتا رہا کہ جنرل ضیاء الحق بھٹو کو نہیں چھوڑے گا۔ میرا استدلال یہ تھا کہ جس فوجی آمر نے یہ سوچے بغیر کہ وفاق کا کیا بنے گا لاہور ہائیکورٹ اور پھر سپریم کورٹ کے صرف پنجابی ججوں سے انہیں سزائے موت دلوائی ہے، جس

نے قسمیں اور ضمانتیں دیکر جھوٹے سلطانی گواہوں کا بندوبست کیا ہے، وہ ہر قیمت پر یہ ''کارنامہ'' انجام دے گا۔ اس رات میں نے شوکت محسن کو اعتماد میں لیکر اپنی اور اس کی چارپائی کوٹھڑی سے باہر نکلوا دی تھی تاکہ ہم اس سوگ میں شریک ہوسکیں۔ ساتھ ہی اسے تاکید کی تھی کہ حسین نقی اور خالد چودھری کو کچھ نہ بتانا ورنہ پوری رات بحث میں گزر جائے گی۔ شوکت محسن نے دو چارپائیاں تو باہر نکلوا دیں لیکن حسین نقی اور خالد چودھری کو اصل بات بتا دی ۔ہمارے پاس ایک چھوٹا سا ریڈیو تھا، ہم نے وہ رات جاگ کر گزاری میرے ساتھی اپنی رائے پر جمے رہے اور میں اپنے اطلاعات کے ذرائع کے مستند ہونے کے موقف پر قائم رہا۔ مارشل لاء حکومت نے بی بی سی کے رپورٹر مارک ٹیلی سمیت تمام ذرائع ابلاغ کا اس طرح ''بندوبست'' کر رکھا تھا کہ صبح آٹھ بجے تک کوئی خبر نشر نہیں ہوئی۔ حسین نقی کو تاریخ بھگتنے کیلئے کسی عدالت میں جانا تھا۔ وہ ''جگ راتے'' کی وجہ سے نیم بیمار سا تھا اس لئے جاتے جاتے مجھ سے یہ گلہ کرتا گیا کہ میری وجہ سے اسے بہت تکلیف اٹھانی پڑی ہے۔ بہرحال پندرہ بیس منٹ بعد ایک ضمیمہ جیل کے اندر آ گیا۔ جس کی سرخی یہ تھی۔ ''نواب محمد احمد قتل کیس کے بڑے ملزم ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دے دی گئی''۔

■ ■ ■

9 اپریل 2009ء

1979ء کے پرنٹ میڈیا نے (اس وقت الیکٹرانک میڈیا صرف سرکاری ٹی وی تھا) بھٹو صاحب کے خون ناحق کے معاملے میں ویسا ہی سفاکانہ کردار ادا کیا جو اس دور کے فوجی جرنیلوں، ہائیکورٹ اور سپریم کورٹ کے پنجابی ججوں نے اختیار کیا تھا۔ بھٹو صاحب سرے سے دفعہ 302 (قتل عمد) کے ملزم ہی نہیں تھے۔ انہیں ABETMENT (اعانت جرم) میں ملوث کیا گیا تھا۔ ایف ایس ایف کے سربراہ مسعود محمود اس مقدمے میں وعدہ معاف گواہ بنے۔ انہوں نے اقبالی بیان میں کہا کہ یہ

کارروائی وزیراعظم بھٹو کے حکم پر عمل میں لائی گئی تھی۔ مقدمے کے دوسرے ملزموں میں ایف ایس ایف کے وہ اہلکار اور افسر شامل تھے۔ جنہوں نے گولی چلانے یا چلوانے کا اقبال کیا اور جن سے قرآن پاک درمیان میں رکھ کر وعدہ کیا گیا تھا کہ بھٹو صاحب کو سزائے موت دینے کے بعد ان کی جان بخش دی جائے گی۔ ایک افسر نے اقبال جرم کرنے سے انکار کر دیا تھا بہرحال سپریم کورٹ میں اپیل کی سماعت کے دوران اس نے بھی اپنا اقبالی بیان دے دیا اور جان بخشی کی ضمانت پر یقین کر لیا۔ تین اور چار اپریل کی درمیانی رات کو صرف بھٹو صاحب کو پھانسی دی گئی۔ مسعود محمود کو جیل سے نکال کر امریکہ بھیج دیا گیا۔ جہاں وہ گمنامی کی زندگی گزارتے گزارتے طبعی موت مرا۔ جنرل ضیاء الحق سزائے موت کے باقی ملزموں کو چھوڑنا چاہتے تھے لیکن فوج کے اندر اور باہر سے اتنا دباؤ پڑا کہ انہیں ہتھیار ڈالنے پڑے پھر جب اقبالی مجرموں کو بلیک وارنٹ ملا تو جیل کے اندر اور باہر چیخ و پکار مچ گئی۔ اندر ملزم وعدہ خلافی کا واویلا کر رہے تھے اور باہر ان کے لواحقین ضامنوں کے دروازے پیٹ رہے تھے۔ لیکن چونکہ ان ملزموں کو پھانسی دیئے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا اس لئے انہیں گھسیٹ کر پھانسی گھاٹ لے جایا گیا اور لٹکا دیا گیا۔

3 اپریل 2009ء کو پروگرام "لائیو ود طلعت" میں احمد رضا قصوری اور میں کچھ وقت کیلئے آمنے سامنے ہوئے تھے اور میں نے ان سے دو معاملات پر گفتگو کی تھی۔ پہلا معاملہ یہ اٹھایا کہ بھٹو صاحب کے دور حکومت کے آخری مہینوں میں بیگم نصرت بھٹو آپ کے گھر گئیں اور ملاقات کے بعد آپ نے بیان دیا تھا کہ ماں چل کر میرے گھر آ گئی ہے۔ میں اپنا الزام واپس لیتا ہوں۔ جواب میں قصوری صاحب نے کہا کہ میں نے ماں نہیں بہن کہا تھا پھر اس واقعہ کے پس منظر میں چھپی ہوئی کسی مخصوص حکمت عملی کی تفصیل بتائی۔ اصل قصہ اس روز کے اخبارات میں بھی پڑھا جا سکتا ہے اور پی ٹی وی کی فوٹیج بھی (اگر ریکارڈ میں موجود ہو) دیکھی جا سکتی ہے۔ اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ بیگم نصرت بھٹو احمد رضا قصوری کی خواہش پر (جس کے ساتھ بعض یقین دہانیاں منسلک تھیں) قصور میں ان کی قیام گاہ پر گئیں اور موصوف ماضی کی

10 اپریل 2009ء

30 سال پہلے کے میڈیا، عدلیہ سمیت اسٹیبلشمنٹ اور پیپلز پارٹی کی مخالف جماعتوں میں اس ایک نکتے پر اتفاق تھا کہ ذوالفقار علی بھٹو کو منظر سے ہٹا دیا جائے تو راستے صاف ہو جائیں گے۔ جنرل ضیاء الحق نے اقتدار سنبھالنے کے بعد قوم سے پہلے خطاب میں کہا تھا کہ ملک کی بقا جمہوریت میں مضمر ہے۔ اس لئے 90 روز میں نئے الیکشن کرائے جائیں گے۔ اقتدار سنبھالنے کے چند روز بعد ایرانی اخبار کیہان انٹرنیشنل کو انٹرویو دیتے ہوئے انہوں نے بھٹو صاحب کو ذہین ترین اور مقبول ترین لیڈر کہا بعد میں سنگدل قاتل قرار دے دیا اس کی ایک وجہ تو اقتدار کا مزہ تھا اور دوسری یہ کہ الیکشن میں پیپلز پارٹی سویپ کرتی نظر آتی تھی۔ پہلی نظر بندی سے رہائی کے بعد جب بھٹو لاہور ائرپورٹ پر اترے تو ہوائی اڈے سے نہر کے دونوں پلوں پر انسانی سروں کا سمندر تھا۔ میں نے 9 اپریل 1986ء کو لاہور میں محترمہ بینظیر کا استقبال نہیں دیکھا۔ لیکن جنہوں نے پہلی رہائی کے بعد بھٹو صاحب کا استقبال اور 1986ء والے جلوس دونوں واقعات دیکھے ہیں۔ وہ میری اس رائے سے اتفاق کرتے ہیں کہ بھٹو صاحب کا استقبال، جس کیلئے 90 فیصد لوگ دور دور سے پیدل چل کر آئے تھے، بے مثال تھا۔ اس موقع پر ایک افسوس ناک واقعہ بھی ہوا۔ ہجوم کی ایک ٹکڑی نے مولانا شاہ احمد نورانی کی کار پر حملہ کر دیا یہ واقعہ ضیاء الحق اور بھٹو صاحب کے درمیان فون پر پہلی تلخ کلامی کا سبب بنا ورنہ اس سے پہلے جب ضیاء الحق نے مری میں نظر بند ذوالفقار علی بھٹو سے ملاقات کی تھی وہ تصویر میں ان کے سامنے اس طرح بیٹھے ہوئے تھے، جیسے خوشامد کر رہے ہوں۔ لیکن بھٹو صاحب اتنے برہم تھے کہ انہوں نے جنرل ضیا کو یہ کہہ کر اپنی جان کا دشمن بنا لیا کہ تم نے آئین توڑا ہے، میں عوام کی طاقت سے اقتدار میں واپس آؤں گا اور تمہاری مونچھیں اکھاڑ کر اپنے بوٹوں کے تسمے بنواؤں گا۔

ضیاء الحق نے 90 روز میں الیکشن کے وعدے پر عمل کرنا چاہا لیکن ملک بھر میں پیپلز پارٹی کی مقبولیت دیکھ کر نہ صرف ضیاء الحق بلکہ پی این اے کی جماعتیں جو جنرل صاحب کی اتحادی تھیں، خوفزدہ ہو گئیں اور ان میں اتفاق ہوا کہ پہلے بھٹو کو ختم کیا جائے۔ جنرل ضیاء نے

کوئی نئی تاریخ دیئے بغیر الیکشن ملتوی کر دیئے۔ اس سے پہلے نواب محمد احمد خاں قتل کیس میں بھٹو صاحب کی پہلی گرفتاری عمل میں آ چکی تھی۔ لاہور ہائیکورٹ کے جسٹس صمدانی نے، جو بعد میں وہاں سے ہٹا دیئے گئے، انہیں ضمانت پر رہا کیا اور بھٹو صاحب کراچی چلے گئے لیکن چند ہی دن بعد فوج نے کلفٹن میں ان کی رہائش گاہ پر چھاپہ مارا، پورے گھر کو درہم برہم کر دیا اور بدتمیزی کی انتہا کر کے بھٹو صاحب کو اٹھا لیا۔ انہیں کوٹ لکھپت جیل لاہور میں لایا گیا اور جسٹس مولوی مشتاق حسین کے سامنے ڈال دیا گیا، جو پھانسی کی سزا سنانے کیلئے بے چین تھے۔ وہ دوران سماعت ان کی تذلیل کرنے کیلئے ہر پیشی پر کوئی نہ کوئی نیا طریقہ اختیار کرتے تھے۔ سپریم کورٹ میں اپنے آخری بیان میں، جو عدالت میں حاضر ہو کر دیا گیا، بھٹو صاحب نے ایک واقعہ یوں بیان کیا تھا ''مجھے ایک دن پہلے عدالت کے بجائے مولوی مشتاق حسین کے چیمبر میں لے جایا گیا۔ جہاں ایک کرسی خالی تھی جب میں نے اس کرسی پر بیٹھنا چاہا تو ڈی ایس پی نے مجھے یہ کہہ کر روک دیا کہ تم ملزم ہو، کرسی پر نہیں بیٹھ سکتے''۔ ایک روایت کے مطابق سزائے موت سنانے کے بعد مولوی مشتاق حسین شام کو خود کوٹ لکھپت جیل گئے اور حکم دیا کہ میرے مجرم کو فوراً پھانسی کی کوٹھڑی میں منتقل کرو جبکہ حکام انہیں اسی اے کلاس سیل میں رکھنا چاہتے تھے جہاں وہ مقدمے کی سماعت کے دوران قید رہے تھے۔ بعد میں لاہور جیل کی پھانسی کی کوٹھڑی سے انہیں راولپنڈی جیل کی ایک ویسی ہی کوٹھڑی میں بھیج دیا گیا جس میں انہیں شدید گرمی اور لو سے ''لطف اندوز'' کرنے کیلئے 24 گھنٹے چھت کا پنکھا چلتا رہتا تھا اور ماحول ''خوشگوار'' رکھنے کیلئے ایک کموڈ بھی موجود تھا۔

دکھوں کی یہ داستان جو 3 اور 4 اپریل کی درمیانی رات کو اپنے اختتام کو پہنچی، بہت لمبی ہے۔ بھٹو صاحب کو قتل کرانے کے بعد جنرل ضیاء الحق نے نومبر میں الیکشن کرانے کا شیڈول دیا۔ لیکن جب انہوں نے مختلف شہروں میں بیگم نصرت بھٹو اور محترمہ بینظیر کے جلسے جلوس دیکھے۔ تو ایک بار پھر ڈر گئے۔ وہ ٹیلی ویژن پر آئے، الیکشن غیر معینہ مدت کیلئے ملتوی کر دیئے اور اعلان کیا کہ میں پہلے اسلامی نظام نافذ کروں گا پھر کچھ اور ہو گا۔ 17 اگست 1988ء کو

جب وہ اس جہاں سے رخصت ہوئے، گیارہ سال میں صرف اسلامی سزائیں متعارف کرا سکے تھے اور افغان جہاد کی شکل میں پاکستان کیلئے ایک کربلا کی بنیاد رکھ چکے تھے جو آج چاروں صوبوں میں برپا ہے۔ افغانستان کی جنگ ہمارے قبائلی علاقوں میں آئی اور پنجاب کے شہروں تک پھیل گئی۔ بلوچستان میں ایک اور آگ بھڑک رہی ہے اور سندھ سے بھی مسلسل دھواں اٹھ رہا ہے۔ بھٹو صاحب کی 30 ویں برسی پر میں نے پیپلز پارٹی قصور کے ایک لیڈر رانا بلند اختر کا ایک مضمون دیکھا تھا، جس میں انہوں نے ذوالفقار علی بھٹو کے ایک مشہور بیان کا حوالہ دیا، جو یوں تھا "اگر ہم نہ رہے تو ہمالیہ روئے گا اور راسپوٹین آئیں گے"۔ بھٹو صاحب کو پھانسی دینے کے بعد ان کے مخالفین یہ کہہ کر اس بیان کا مذاق اڑاتے تھے کہ ان کے قتل پر ایک کنکر بھی نہیں رویا۔ جہاں تک رونے کا تعلق ہے تو 4 اپریل 1979ء کی رات کو ملک بھر میں سناٹا اور سوگ تھا اور لاکھوں گھروں میں چولہا نہیں جلا، مرد عورتیں اور بچے پھوٹ پھوٹ کر روئے۔ ہمالیہ کے آنسو اس لئے نہیں دیکھے جا سکے کہ اس کے سامنے کوڑوں اور سنگینوں کی دیوار تنی ہوئی تھی۔ آخر میں ایسے راسپوٹین بھی آئے کہ اب ہماری حالت زار پر رو رو کر ہمالیہ کے آنسو ہی ختم ہو چکے ہیں۔ جس ملک کی حالت یہ ہو کہ صبح کو گھر سے نکلنے والوں کی بخیریت واپسی یقینی نہیں ہوتی اور گھروں کے اندر رہنے والوں کو ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ ابھی کچھ اسلحہ بردار چھتوں یا دروازوں سے اندر گھسیں گے اور پھر خدا جانے وہ اگلا دن دیکھ پائیں گے یا نہیں۔ ہمارے ایک طرف امریکی اور دوسری طرف بھارتی خونخوار ہیں اور درمیان میں بم بردار موت کے فرشتے دندنا رہے ہیں۔ اوپر نیچے وفاقی اور صوبائی حکومتیں ہیں، جن کے سر تو موجود ہیں لیکن پاؤں تلے زمین نہیں۔ غریب کا مسئلہ لوڈشیڈنگ روٹی اور روزگار ہے۔ سیاسی جماعتوں کو مڈٹرم الیکشن کرانے کا شوق ہے۔ ہم کیا لوگ ہیں کہ اپنے قبائلی علاقوں اور سوات میں دہشت گردوں اور انتہا پسندوں سے تو لڑ نہیں سکتے لیکن امریکہ کو ناکوں چنے چبوانے کے خواب دیکھتے ہیں۔ ایوان وزیراعظم پر فوجی یلغار سے پہلے بھٹو صاحب اور پی این اے کے درمیان معاہدہ ہو چکا تھا۔ جنرل ضیاء الحق نے رات کے اندھیرے میں سب کچھ درہم برہم کر

دیا۔ یہ اسی رات کا اندھیرا ہے، جو ہماری صبحوں دوپہروں، شاموں اور چاندنی راتوں کو نگل رہا ہے۔ یہ ایسی رات ہے جس میں بیٹھ کر یہ بھی نہیں سوچا جا سکتا کہ اس کے بعد اندھیرا نہیں اجالا ہے۔

■ ■ ■

13 اپریل 2009ء

میڈیا نے ذوالفقار علی بھٹو کے ساتھ جس سفاکی اور بے انصافی سے کام لیا، اس کی کسی حد تک تلافی اس سال 3 اور 4 اپریل 2009ء کو ہو چکی ہے۔ پرانی اور نئی نسل کو پتہ چلا ہے کہ 1977ء کے مارشل لاء نے ہمارے ملک کو کتنے بڑے لیڈر سے محروم کر دیا تھا۔ ہم نہ صرف ایک عظیم لیڈر گنوا بیٹھے بلکہ جنرل ضیاء الحق نے اصلی منزل کی طرف، جو قائداعظم محمد علی جناحؒ نے متعین کی تھی، پاکستان کا سفر بھی کھوٹا کر دیا۔ آج کا پاکستان اس تباہی کا ایک عبرت ناک نمونہ ہے جس کی بنیاد 4 جولائی 1977ء کو رکھی گئی۔

بھٹو صاحب کو سزائے موت دینے کے بعد جنرل ضیاء الحق نے اسلام کے نام پر اپنے اقتدار کو طول دیا۔ فرقہ پرستی، صوبائی و لسانی تنازعات اور انتہا پسندی کو فروغ ملا۔ بیگم نصرت بھٹو اور محترمہ بینظیر گرفتاریوں، نظر بندیوں اور جیلوں کے مسلسل عذاب سے تنگ آ کر جلاوطن ہو گئیں۔ 9 اپریل 1986ء کو جب بینظیر صاحبہ وطن واپس آئیں تو بھٹو صاحب ایک بار پھر زندہ ہو کر کھلے آسمان کے نیچے ظاہر ہوئے اور اب تک ہر الیکشن میں اپنی زندہ عوامی طاقت دکھاتے رہے ہیں۔ 1997ء کا واحد الیکشن ایسا تھا جس میں فاروق لغاری صاحب کی مہربانی سے پیپلز پارٹی کو ناقابل یقین شکست ہوئی۔ اُس سے پہلے 1990ء میں دھاندلی کے باوجود وہ دوسرے نمبر پر نشستیں جیتنے والی پارٹی بن گئی تھی، ہر قسم کی ہیرا پھیری کے باوجود 2002ء میں بھی اس نے اتنی نشستیں جیت لی تھیں کہ جنرل پرویز مشرف مخدوم امین فہیم کو وزیراعظم

بنانے کیلئے بے چین تھے۔ فارمولا وہی پرانا تھا۔ ''مائنس بھٹو'' محترمہ بینظیر نے یہ تجویز نہیں مانی تو ایجنسیوں کے ذریعے پارٹی کے ایک حصہ کا ضمیر جگا کر مسلم لیگ (ق) کی مخلوط حکومت بنا دی گئی۔

1985ء کے غیر جماعتی الیکشن کے بعد اب تک کل 6 الیکشن ہوئے ہیں۔ چار میں پیپلز پارٹی نہ صرف جیتی بلکہ حکومت بنانے میں بھی کامیاب ہوئی۔ لیکن اسٹیبلشمنٹ کو ابھی تک یہ ادراک نہیں ہوا کہ جب تک پیپلز پارٹی کو اقتدار کی مدت پوری کرنے کے بعد سیاسی عمل کے ذریعے عوام کے دلوں سے نہیں نکالا جائے گا۔ وہ بار بار نمودار ہو گی اور اقتدار کی دعویدار بنتی رہے گی۔ بھٹو صاحب کے قتل کے بعد محترمہ بینظیر نے 1988ء میں مفاہمت کا عمل شروع کیا لیکن جس غلام اسحاق کو اپنے ووٹوں سے صدر بنوایا، وہی دشمن بن گیا۔ ضیاء الحق سے لیکر فاروق لغاری تک بھٹو خاندان کو احسانات کے بدلے میں غداریوں کا صلہ ملا۔ شکلیں اور نام تبدیل ہوتے رہے لیکن پیپلز پارٹی کا مقدر نہیں بدلا۔ موجودہ منظر نامے میں کبھی کبھی اسی مقدر کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ دشمن اسٹیبلشمنٹ کے مقابلے میں اس پارٹی کی اس سے بڑی بے بسی اور کیا ہو سکتی ہے کہ محترمہ بینظیر بھٹو وزیراعظم تھیں اور ان کے اکلوتے زندہ بھائی مرتضٰی بھٹو کو کراچی کی سڑک پر گھر سے تھوڑی دور قتل کر دیا گیا تھا۔ بینظیر صاحبہ اپنے باپ کی تدفین کے وقت قید تھیں۔ ایک بھائی کی میت کو فرانس سے لا کر دفن کیا اور دوسرے مقتول بھائی کو کراچی سے گڑھی خدا بخش لیکر گئیں لیکن موت سے لڑ جانے کی خاندانی روایت پر قائم رہتے ہوئے سنگین خطرات کے باوجود وہ پاکستان واپس آئیں پھر کراچی کے خودکش دھماکے سے معجزانہ طور پر بچنے کے باوجود لیاقت باغ راولپنڈی تک منتظر موت کا تعاقب کیا اور اس آخری معرکے میں اپنی جان بھی نذر کر دی۔ جس طرح پنڈت نہرو کا سیاسی ورثہ اندرا گاندھی سے راجیو گاندھی اور پھر سونیا گاندھی تک آیا ہے۔ اسی طرح بھٹو صاحب کی سیاسی وارثت آصف علی زرداری کو ملی ہے۔ بھارت اور طرح کا ملک ہے اس لئے سونیا کے برعکس وہ سارے خطرے اور سازشیں زرداری صاحب کے سر پر منڈلا رہی ہیں۔ جن سے خود بھٹو صاحب، ان

کی شاندار بیٹی اور دو بیٹے دوچار ہوئے۔ میں نے اوپر بھی مقدر کا ذکر کیا ہے۔ مقدر انسانوں کا بھی ہوتا ہے اور خاندانوں کا بھی۔ خدا جانے یہ مقدر کا سلسلہ ہے یا بھٹوز کے سیاسی نمک میں کسی کھوٹ کا سبب کہ ہر بار اسے اپنے بنائے ہوئے بتوں سے زک پہنچتی رہی۔

1961ء میں ترکی کے جنرلوں نے ملک کے منتخب وزیراعظم عدنان میندریس کو پھانسی دی تھی۔ ذوالفقار علی بھٹو اس وقت وزیر خارجہ تھے۔ وہ رحم کی اپیل کرنے کیلئے خود ترکی گئے تھے لیکن اس دور کے ترک جنرلوں کو سمجھانے میں ناکام رہے۔ تیس سال بعد جب وہاں جمہوری حکومت آئی پارلیمنٹ نے مقتول کی روح سے معافی مانگی، انہیں قومی ہیرو قرار دیا۔ ازمیر ائرپورٹ کا نام عدنان میندریس ائرپورٹ رکھا گیا۔ چھوٹے اور بڑے شہروں میں سٹی کونسلوں نے بلیوارڈوں اور چھوٹی بڑی سڑکوں کے نام عدنان میندریس کے نام پر رکھے۔ اس طرح کے اقدامات سے ظلم اور ظلم کا نشانہ بننے والے قومی لیڈروں کا قرض تو ادا نہیں ہوتا۔ صرف دکھ اور پچھتاوے کی علامتیں ملکوں اور قوموں کی زندگیوں کیلئے آئندہ کا سبق بن جاتی ہیں اور جانے والوں کی یاد ہمیشہ کیلئے زندہ و پائندہ ہو جاتی ہے۔ بھٹو صاحب کے بعد محترمہ کو ہر طرف سے گھیر کر شہید کیا، وہ گاڑی کے اندر کھڑے ہو کر سر باہر نہ نکالتیں تب بھی کہانی تبدیل نہ ہوتی۔ خودکش دھماکے کے بعد گاڑی تباہ ہونے پر وہ زندہ باہر نکلتیں تو متبادل منصوبے پر عملدرآمد ہو جاتا۔ جس طرح ذوالفقار علی بھٹو کو راولپنڈی جیل میں پھانسی دینے کا فیصلہ اٹل تھا، اسی طرح محترمہ بینظیر کیلئے مقتل بھی پہلے سے لیاقت باغ کے باہر تیار کیا جا چکا تھا اور سارے انتظامات مکمل تھے۔ 2008ء کے انتخابات کے بعد مفاہمت کی فضا میں ایک نئی پارلیمنٹ نے جنم لیا تھا۔ قومی اسمبلی میں محترمہ بینظیر بھٹو کیلئے متفقہ دعائے مغفرت اور قرار دادیں منظور ہوئیں۔ توقع تھی کہ یہ جمہوریت ذوالفقار بھٹو کا تیس سال پرانا قرض بھی اسی طرح ادا کر دے گی۔ جس طرح ترکی میں عدنان میندریس کا قرض چکایا گیا تھا لیکن صدر آصف علی زرداری کا کہنا ہے کہ میاں نواز شریف نے اتفاق نہیں کیا۔ میاں صاحب 12 اکتوبر 1999ء کے بعد، تقریباً اسی تجربے سے گزرے، جس کے نتیجے میں بھٹو صاحب کو قید کے عذاب سے

گزر کر دوسری دنیا میں جانا پڑا تھا۔ میاں نواز شریف موت کے پنجوں سے بال بال بچ کر جلاوطن ہو گئے تھے۔ بھٹو صاحب کا قرض اتارنے کے سلسلے میں میاں نواز شریف کے تحفظات میری سمجھ میں نہیں آئے۔ ممکن ہے اس وجہ سے بھی کہ سیاست کی دنیا کے اصول اور ضابطے عام انسانی جذبات اور احساسات سے مختلف ہوتے ہیں۔

■ ■ ■

بھٹو اور فوج

12 اکتوبر 2006ء

''بھٹو ایک بے رحم آمر اور فاشسٹ تھا''۔ یہ ہے وہ ''مختصر فیصلہ'' جو ہمارے سابق ''جمہوری صدر'' اور چیف آف آرمی سٹاف جنرل پرویز مشرف نے اپنی کتاب ''اِن دی لائن آف فائر'' میں سنایا تھا۔ ہمارے جنرل حضرات پالیسیوں کا تسلسل کبھی نہیں ٹوٹنے دیتے۔ جنرل ضیاء الحق نے بھٹو کو تختہ دار پر چڑھایا تھا۔ اب جنرل مشرف نے ان کی قبر پر ایک تفصیلی کتبہ لکھا ہے جو بڑی حد تک ناانصافی پر مبنی ہے۔ پیٹی بندی اور بھائی بندی کا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے انہوں نے جمہوریت اور ملک کی تباہی کیلئے اپنے پیش رو فوجی حکمرانوں، فیلڈ مارشل ایوب خان، جنرل یحییٰ خان اور جنرل ضیاء الحق کو کٹہرے میں کھڑا کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ وجہ وہی ہے جو ہمارے نظام میں سویلین کے مقابلے میں فوجی حکمرانوں کو ممتاز کرتی ہے اور انہیں ہر معاملے میں تحفظ (IMMUNITY) دیتی ہے۔ وہ آئین سے کھیلنے اور نظام حکومت کی شکلیں بدلنے کے باوجود، استحکام اور جمہوریت کی علامت کہلواتے ہیں اور ہر قسم کے احتساب سے بالاتر ہوتے ہیں۔ طے شدہ اصولوں کے مطابق سیاستدانوں کیلئے کوئی معافی نہیں۔ وہ اقتدار میں ہوں تو فوج سے خوفزدہ رہتے ہیں اور نکال دیئے جائیں تو ان کی پشت پر کرپشن اور ملک دشمنی کا ڈھول باندھ دیا جاتا ہے۔

بھٹو اور بینظیر سے جنرلوں کی مخاصمت کی کوئی ظاہری وجہ سمجھ نہیں آتی۔ ریکارڈ کا جائزہ لیا جائے تو فوج کے حق میں بھٹو مرحوم کی خدمات بے حساب تھیں۔ تنازعہ کشمیر کے ساتھ ان کی

کمٹمنٹ ہر لحاظ سے مکمل تھی۔ 1965ء کی جنگ میں ہزار سال لڑنے کا نعرہ لگا کر وہ قوم کے واحد سویلین ہیرو کے طور پر ابھرے۔ کشمیر سے کمٹمنٹ کا قدرتی مطلب فوج کے ادارے کے ساتھ کمٹمنٹ ہے۔ 65ء کی جنگ کے بعد بھٹو صاحب نے اعلان تاشقند کے موقع پر صدر ایوب خان کے فیصلے سے اختلاف کیا اور وہ کابینہ سے فارغ ہو گئے۔ پھر انہوں نے اپنی سیاسی پارٹی بنائی۔ بھٹو کا ٹارگٹ ایوب خان کی ذات اور اقتدار تھا۔ وہ اعلان تاشقند کے راز کی بات کرتے تھے اور اپنے بھارت مخالف موقف کو اجاگر کرتے تھے۔ یحیٰی خان کے دور میں وہ مارشل لاء اور جنرلوں کو ہدف تنقید ضرور بناتے رہے لیکن مجموعی طور پر فوج کے اندر اِن کیلئے اور ان کے اندر فوج کیلئے دوطرفہ خیر سگالی کا جذبہ اتنا گہرا تھا کہ اب تک تقریباً ہر الیکشن میں پیپلز پارٹی کو چھاؤنیوں کے علاقوں سے اکثریتی ووٹ ملتے رہے ہیں اور فوجی بھرتی کے چیدہ چیدہ علاقوں میں بھی بھٹو اور پیپلز پارٹی کا ووٹ بنک پھانسیوں، کوڑوں اور جنرلوں کے فتوؤں کے باوجود مضبوطی سے قائم ہے۔

1970ء کے انتخابات میں پیپلز پارٹی پنجاب اور سندھ میں اتنی اکثریت کے ساتھ جیتی کہ بھٹو مرحوم بجا طور پر یہ دعویٰ کرتے تھے کہ ''پنجاب اور سندھ کی چابیاں میرے پاس ہیں''۔ مغربی پاکستان میں مجموعی نشستوں کے حوالے سے بھی وہ قومی اسمبلی میں شیخ مجیب الرحمٰن کی فیصلہ کن اکثریت کے سامنے برابر نہ سہی لیکن ایک طاقتور حریف تھے۔ یہ بات ڈھکی چھپی نہیں کہ مجیب الرحمٰن کا ایجنڈا کیا تھا۔ اگر اس تھیوری پر اصرار کیا جائے کہ مجیب مشرقی پاکستان کو الگ نہیں کرنا چاہتے تھے تب بھی یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے 6 نکاتی آئین کے ذریعے ایک ایسے پاکستان کا خاکہ سوچ رہے تھے جس میں کشمیر سمیت تمام متنازعہ امور بھارت کی شرطوں پر اور اس کی مرضی کے مطابق طے کر لئے جاتے۔ وفاقی دارالحکومت ڈھاکہ منتقل ہو جاتا اور زیادہ نہیں تو مشرقی پاکستان کو فوج کی بالادستی اور مداخلت سے نجات مل جاتی۔ ستم ظریفی دیکھئے کہ اقتدار میں آنے کے بعد وہ ''بنگلہ بندھو'' (بابائے بنگال) ہونے کے باوجود اپنے ہی گھر میں پورے خاندان سمیت اپنی ہی فوج کے افسروں اور جوانوں کی گولیوں

کا نشانہ بن گئے اور ان کے ساتھی جیلوں میں ہلاک کر دیئے گئے۔ ایک بیٹی حسینہ واجد باقی بچیں جو ملک سے باہر تھیں۔ وہ آج تک شیخ مجیب کے ووٹ بینک کی وارث ہیں اور تین بار وزیراعظم منتخب ہو چکی ہیں۔ خیر یہ ایک الگ کہانی ہے۔

شیخ مجیب الرحمٰن اپنی اکثریت کے بل بوتے پر پورے 6 نکات پر مبنی آئین منظور کروانا چاہتے تھے۔ بھٹو صاحب نے یہ موقف اپنایا کہ آئین کے خدوخال قومی اسمبلی کے اجلاس سے پہلے طے ہونے چاہئیں۔ ایک رائے یہ ہے کہ وہ مغربی پاکستان کو الگ کر کے خود اقتدار میں آنا چاہتے تھے (فوج کی موجودگی میں کوئی سویلین سیاستدان اس طرح کا خیال دل میں بھی لا سکتا ہے؟) لیکن دوسری اور درست رائے یہ ہے کہ وہ 6 نکاتی آئین قبول کر کے 5 پاکستانوں (مختلف ناموں والے) کی راہ ہموار کرنے کے خلاف تھے۔ 6 نکاتی آئین بنیادی طور پر فوج کے اس بالادست وجود کی نفی تھا جس کی بنیاد پر ہمارے جنرل پورے ملک پر حکمرانی کو اپنا حق سمجھتے تھے۔ قیام پاکستان کے بہت تھوڑے عرصے بعد، لیاقت علی خان کے دور میں ہی کچھ فوجی افسروں نے راولپنڈی سازش کے ذریعے اقتدار پر قبضہ کرنے کی ایک ناکام کوشش کی تھی پھر 1958ء میں یہ خواب میجر جنرل (ر) سکندر مرزا اور جنرل ایوب خان کے ذریعے شرمندہ تعبیر ہوا اور 10 سال کے بعد جب عوام خصوصاً مشرقی پاکستانی بغاوت کیلئے سڑکوں پر نکلے تو جنرل یحیٰی نے امن وامان کی بحالی میں مدد دینے کے بجائے ''اپنا حق'' مانگ لیا۔

6 نکات کے راستے میں رکاوٹ بن کر ذوالفقار علی بھٹو درمیانی راستہ نکالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ مجیب الرحمٰن کے ساتھ مل کر عوام کے حق حکمرانی کی بات کرتے تب بھی فوج مجیب کے منصوبے پر عملدرآمد کی اجازت نہ دیتی اور کوئی دوسرا طریقہ اختیار کر کے مجیب اور بھٹو دونوں سے چھٹکارا حاصل کر لیتی۔ ہر صورت میں منطقی نتیجہ وہی تھا جو 1971ء میں نکلا یعنی مجیب الرحمٰن کے حق میں مداخلت کر کے بھارت نے بنگلہ دیش بنوا دیا۔ حالات اور نتائج کا مختصر لب لباب یہ ہے کہ بھٹو صاحب جنرلوں کے راستے میں نہیں آئے۔ وہ فوج کی بے انداز طاقت کا نشانہ نہیں بننا چاہتے تھے جس کا عملی مظاہرہ انہیں ڈھاکہ میں اس رات دکھا دیا گیا تھا

جب شیخ مجیب سے بات چیت ناکام ہونے کے بعد جنرل یحییٰ خان انہیں انٹرکانٹی نینٹل ہوٹل ڈھاکہ کی آخری منزل کے اس کمرے میں چھوڑ آئے تھے جس کی کھڑکیاں دھان منڈی (شیخ مجیب الرحمٰن کی قیام گاہ) کی طرف کھلتی تھیں۔ ٹینکوں اور توپوں کے ساتھ کیے جانے والے اس آپریشن کا منظر دیکھنے کے بعد جب بھٹو مرحوم کراچی کے ہوائی اڈے پر واپس اترے تو دیکھنے والوں کا کہنا تھا کہ وہ بے حد نروس تھے اور ان کی ٹانگیں کانپ رہیں تھیں۔ ایک جملے میں انہوں نے اخبار نویسوں سے محض یہ کہا ''خدا پاکستان کو بچائے'' سرکاری خبر رساں ایجنسی نے اس جملے کو تبدیل کر کے ''خدا نے پاکستان کو بچا لیا ہے'' بنا لیا جو ان کے لئے طعنہ بنا رہا۔ کراچی ایئرپورٹ سے اپنی قیام گاہ پر پہنچنے کے بعد انہوں نے پہلا کام یہ کیا کہ فیصل آباد میں ''انقلاب'' کی تحریک (جس کے بنیادی نعرے یہ تھے کارخانہ مزدور کا، زمین کسان کی، قبضے کرلو اور اپنا حق چھین لو) چلانے والے پارٹی لیڈروں شیخ محمد رشید اور مختار رانا وغیرہ کو حکم جاری کیا کہ یہ سلسلہ بند کر کے اپنے اپنے گھروں کو واپس چلے جاؤ ورنہ ہم سب مارے جائیں گے۔ سانحہ مشرقی پاکستان اور بعد کے واقعات کے حوالے سے بھٹو کے کردار کے دو پہلو نمایاں ہو کر سامنے آتے ہیں۔ نمبر 1 وہ سیاست میں فوج کی مہم جوئی کے مخالف تھے اور نمبر 2 وہ پاکستان اور اسلامی دنیا کیلئے اپنے خواب کی تعبیر اس طرح دیکھتے تھے کہ پاکستان کی فوجی طاقت کو بڑھا کر اس آئیڈیل سطح پر پہنچانا چاہئے کہ وہ بھارت کو آنکھیں دکھا کر اپنا دفاع کرنے کے علاوہ مسلمان دنیا کے لشکر شمشیر زن کا کردار بھی ادا کر سکے۔ یہی وہ تضاد تھا جس کی وجہ سے بھٹو صاحب اس حقیقت کو نظر انداز کر گئے کہ ہمارے جیسے اخلاقی اور ذہنی طور پر مفتوح اور آئین جیسی کتابوں کے تقدس سے بے بہرہ ملکوں میں بے انداز اور بے لگام مسلح طاقتیں اصول اور ضابطے خود متعین کرتی ہیں اور کتابوں میں چھپے ہوئے نہتے الفاظ ان کے راستے میں دیوار نہیں بنتے۔

■ ■ ■

13 اکتوبر 2006ء

''اِن دی لائن آف فائر'' میں کہا گیا کہ بھٹو کی دھمکی کی وجہ سے نیا آئین بنانے کیلئے اسمبلی کا اجلاس منعقد نہ ہو سکا۔ بھٹو اور فوجی حکمرانوں کے ایک مختصر ٹولے کے محور نے پاکستان کو تباہ کر دیا۔ مجیب الرحمٰن، بھٹو اور یحییٰ کے ہاتھوں میں کھیلے اور انہوں نے منتخب وزیراعظم ہونے کے باوجود مغربی پاکستان کے چاروں صوبوں کا دورہ کر کے عوام کے خدشات دور نہیں کیئے۔

جنرل یحییٰ خان ملک کے صدر، چیف آف آرمی سٹاف اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر تھے۔ جنرل پرویز مشرف کے پاس پہلے دونوں عہدے پورے اختیارات کے ساتھ موجود ہیں اور تیسرا عہدہ ایک تبدیل شدہ شکل میں ان دو عہدوں کے اندر شامل ہے۔ آرمی چیف کی طاقت کا مظاہرہ انہوں نے 12 اکتوبر 1999ء کو اس طرح پیش کیا تھا کہ خود فضا میں پرواز کر رہے تھے اور نیچے زمین پر کور کمانڈروں نے تاریخ کا سب سے بڑا عوامی مینڈیٹ لینے والے وزیراعظم کو برطرف کر کے گرفتار کر لیا اور چند گھنٹوں میں پورے ملک کا نظام اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ نواز شریف کے وزیر، ارکان اسمبلی اور متوالے ڈر کے مارے بلوں میں گھس گئے اور پھر اس تبدیلی پر مٹھائیاں بانٹنے والی قابل رحم مخلوق خوشی کے نعرے لگاتی ہوئی سڑکوں پر نکل آئی۔ فوج کا اپنا نظام ہے۔ عام جوان سے لے کر کور کمانڈر تک آرمی چیف کے حکم کی تعمیل کا پابند ہوتا ہے اور ''جنرل چشتیوں'' کو بہت بعد میں اپنی خدمات کے حوالے سے احساس زیاں اس وقت ہوتا ہے جب وہ ''پھرتے ہیں میر خوار، کوئی پوچھتا نہیں'' کی مثال بن جاتے ہیں۔

1970ء کے انتخابات میں شیخ مجیب الرحمٰن کو مشرقی پاکستان سے قومی اسمبلی کی 160 نشستیں ملی تھیں۔ پیپلز پارٹی نے مغربی پاکستان کے چاروں صوبوں سے 138 میں سے 82 نشستیں حاصل کیں۔ جس ملک میں ایک سو ساٹھ نشستوں والے کی اوقات یہ تھی کہ اسے چوزے کی طرح گھر سے پکڑ کر مغربی پاکستان کی جیل میں پھینک دیا گیا وہاں 82 نشستوں والے ذوالفقار علی بھٹو کی اوقات کیا تھی؟ وہ زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتے تھے کہ وقت ٹال کر خود کو اور اپنی پارٹی کو کسی بہتر وقت کیلئے بچا لیتے۔ قومی اسمبلی میں بھٹو کے ساتھیوں کی اکثریت کا

تعلق پنجاب سے تھا اور ہم پنجابی اتنے بڑے حریت پسند ہیں کہ خونی لٹیروں کے سردار نادر شاہ کو اپنا مسیحا اور ہیرو تسلیم کرتے ہیں جس نے دلی میں لوٹ مار کرنے والے چند سپاہیوں کے قتل پر آگ بگولا ہو کر نہتے شہریوں، عورتوں، مردوں اور بچوں کے بلاامتیاز قتل عام کا حکم دے دیا تھا اور دلی میں نہتے انسانوں کے خون کی ندیاں بہا دی تھیں۔ بھٹو فوج سے محاذ آرائی کا راستہ اختیار کرتے تو پہلے پنجابی منتخب ارکان کی اکثریت ان کا ساتھ چھوڑ جاتی اور پھر سندھی وڈیرے دباؤ میں آ کر حوصلہ ہار دیتے۔ مجیب الرحمٰن کے پیچھے مشرقی پاکستانی عوام کی 95 فیصد اکثریت تھی جو مرنے مارنے پر تلی ہوئی تھی۔ بھارت کی برتر فوجی قوت کی پشت پناہی کے علاوہ انہیں روس اور غالباً امریکہ کی آشیر باد حاصل تھی۔ بھٹو کے ساتھ محض ایک غیر منظم ہجوم تھا جو ہمیشہ آنسو گیس کے چند گولوں سے منتشر ہو جاتا تھا۔ وہ شیخ مجیب الرحمٰن کے اصل عزائم سے واقف تھے وہ ایک عظیم، بے پناہ فوجی اور ایٹمی طاقت والے پاکستان کا خواب دیکھتے تھے اس لئے مجیب کے ساتھ کھڑے ہو کر اپنے آپ اور اپنی پارٹی کو تباہ کروانے کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ صدر، آرمی چیف اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر یعنی ایک تھری اِن ون عفریت سے مقابلے کا سیدھا مطلب موت تھا۔ بھٹو صاحب پر زیادہ سے زیادہ الزام یہ لگ سکتا ہے کہ انہوں نے خودکشی کا راستہ اختیار نہیں کیا۔ یحیٰی خان اور ان کے قریبی جنرل اپنی قربانی دینے پر تیار ہوتے تو شیخ مجیب کو وزیراعظم بنانے کا باضابطہ اعلان کر کے ڈھاکہ میں قومی اسمبلی کا اجلاس ہونے دیتے اور ٹانگیں توڑنے جیسی دھمکیوں پر مبنی تقریروں کی کوئی پروا نہ کرتے۔ بھٹو صاحب کو علم تھا کہ فوج 6 نکاتی آئین بننے دے گی نہ ہی مجیب الرحمٰن کو اقتدار دے کر ملک اور اپنے آپ کو اس کے رحم و کرم پر چھوڑے گی۔ وہ مجیب الرحمٰن کے 6 نکات پر افہام و تفہیم کر کے کوئی درمیانی راستہ نکالنا چاہتے تھے۔ اسی وجہ سے مجیب الرحمٰن کو بار بار خبردار کرتے رہے کہ اس ملک میں دو نہیں تین طاقتیں ہیں۔ عوامی لیگ، پیپلز پارٹی اور مسلح افواج۔

ملک کو تباہ کرنے کی ذمہ داری بھٹو پر ڈالنی ہے تو یہ بھی فرض کرنا پڑے گا کہ صدر، آرمی چیف اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے خدائی اختیارات اصل میں بھٹو صاحب کے پاس

تھے۔ ڈھاکہ آپریشن انہی کے حکم پر کیا گیا تھا اور وہ اسے کامیابی سے پایہ تکمیل تک پہنچانے اور اپنی آنکھوں سے دیکھنے کیلئے انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل کے ایک کمرے میں رات بھر ''قیدی'' بن کر بیٹھے رہے۔ اس تھیوری کو آگے بڑھاتے ہوئے یہ بھی ماننا پڑے گا کہ فاتحین کی لوٹ مار اور پانوں کی تجارت میں بھی بھٹو صاحب کو حصہ ملتا تھا۔ انہی کے حکم پر یا اجازت سے مورچوں کے اندر اور بنگالیوں کے گھروں میں گھس کر مسلمان عورتوں کو گینگ ریپ کا نشانہ بنایا گیا۔ بھٹو کے خلاف یہ چارج شیٹ اس وقت سے شروع کرنی پڑے گی جب پنجابیوں اور مہاجروں نے مل کر یہ تاریخی فیصلہ کیا کہ ایک صوبے اور ایک شہر کی اقلیتی زبان اکثریتی صوبے مشرقی پاکستان سمیت سارے ملک کی سرکاری زبان ہونی چاہئے کیونکہ یہی وہ پہلا تنازعہ تھا جس کے نتیجے میں ڈھاکہ میں مغربی پاکستان کے خلاف پہلا شہید مینار وجود میں آیا۔ مزید آگے چلئے اور الزام لگایئے کہ خواجہ ناظم الدین اور حسین شہید سہروردی جیسے متحدہ پاکستان کے علمبردار بھی بھٹو صاحب کے کہنے پر خوار کئے گئے اور بے اثر بنائے گئے۔ یہاں میں مجید نظامی صاحب کا ایک آنکھوں دیکھا واقعہ بیان کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ وہ حسین شہید سہروردی سے ایک ملاقات کا احوال یوں بیان کرتے ہیں کہ سہروردی مرحوم پلنگ پر لیٹے ہوئے تھے اور شیخ مجیب الرحمٰن ان کے پاؤں دبا رہے تھے۔ ایک موقع پر گفتگو کے درمیان مداخلت کر کے مجیب نے مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا خیال پیش کر دیا۔ ردعمل یہ ہوا کہ سہروردی مرحوم نے اسی پاؤں کی (جو وہ دبوا رہے تھے) ٹھوکر مار کر مجیب کو چارپائی سے فرش پر گرا دیا۔ سہروردی مشرقی پاکستان کے انتہائی مقبول سیاسی رہنما تھے اور مغربی پاکستان والوں کو بھی ایوب خان سے زیادہ محبوب تھے۔ وہ متحدہ پاکستان کے اتحاد کی علامت بن سکتے تھے۔ کیا انہیں اور ان جیسے دوسرے محب وطن پاکستانیوں کو بھٹو نے گمنامی کی موت مرنے پر مجبور کیا اور سارا کھیل علیحدگی پسند مجیب کے ہاتھ میں دے دیا؟

مشرقی پاکستان کو علیحدہ کرنے کی اصل بنیاد فیلڈ مارشل ایوب خان کے دور میں رکھی گئی۔ جب وہاں کے عوام اور اصل لیڈروں کو یہ یقین دلا دیا گیا کہ فوج کی موجودگی میں وہ

کبھی پورے پاکستان پر اپنا حق حکمرانی حاصل نہیں کر سکتے۔ ون مین ون ووٹ کے بجائے ان پر متناسب نمائندگی مسلط کی گئی۔ ملک کے دونوں بازوؤں میں معاشی تفاوت اتنا زیادہ تھا کہ بنگالی کراچی کو دبئی سمجھ کر روزی کمانے یہاں آ جاتے تھے۔ انہیں جمہوری حقوق دیئے گئے نہ معاشی۔ اور تو اور بی ڈی ممبروں والے صدارتی انتخاب میں بھی دھونس دھاندلی اور ترغیب کے ذریعے انہیں اس حق سے محروم کر دیا گیا کہ وہ مادر ملت محترمہ فاطمہ جناح کو منتخب کروا کے جمہوری پاکستان میں اپنا کردار ادا کر سکیں۔ اگر تلا سازش کیس جیسے ڈرامے رچا کر شیخ مجیب الرحمٰن کو زیرو سے ہیرو بنایا گیا اور نتیجہ یہ نکلا کہ جب مشرقی پاکستان کے باشندے غصے اور انتقام کا بم بن کر پھٹے تو اگر تلا ٹریبونل کے سربراہ ریٹائرڈ جسٹس ایس اے رحمٰن کو ڈھاکہ سے جان بچا کر بھاگنا پڑا۔ ایوب خان کے خلاف ایجی ٹیشن مغربی پاکستان سے بھی اٹھا لیکن مشرقی پاکستان میں عام بغاوت کی صورتحال تھی۔ فیلڈ مارشل صاحب نے سیاسی مفاہمت کیلئے گول میز کانفرنس بلائی جس میں شیخ مجیب الرحمٰن بھی شریک ہوئے۔ ملک کا اتحاد قائم رکھنے کے اس آخری موقع کا اس طرح فائدہ اٹھایا جا سکتا تھا کہ ایوب خان مستعفی ہو کر اپنے ہی آئین کے تحت اقتدار سپیکر عبدالجبار خان کے سپرد کر دیتے۔ جن کا تعلق مشرقی پاکستان سے تھا اور پھر منصفانہ انتخابات کے ذریعے آئندہ کیلئے کوئی حل تلاش کر لیا جاتا لیکن ایوب خان کو ''محفوظ راستہ'' چاہئے تھا اور جنرل یحییٰ کو اقتدار سامنے نظر آ رہا تھا اس لئے مارشل لاء لگ گیا۔ یحییٰ نے انتخابات کرائے شیخ مجیب الرحمٰن کی عوامی لیگ نے دو نشستوں کے سوا پورے صوبے میں مد مقابل سیاسی جماعتوں کا صفایا کر دیا۔ عوامی لیگ کے امیدوار نا قابل تصور اکثریت سے جیتے۔ مخالفوں کی بے حساب ضمانتیں ضبط ہوئیں۔ انتخابی مہم کے دوران مجیب الرحمٰن کا رویہ یہ تھا کہ انہوں نے ایک مرتبہ لاہور آ کر ناصر باغ میں جلسہ عام سے خطاب کیا۔ وہاں اسلامی جمعیت طلبہ کے چند کارکنوں نے مخالفانہ نعرے لگا دیئے۔ یہ معمول کا چھوٹا سا ہنگامہ تھا لیکن مجیب الرحمٰن انتہائی حقارت سے یہ کہہ چلے گئے کہ مجھے تمہارے ووٹ نہیں چاہئیں۔ جب بھی ملک ٹوٹنے کی بات ہوتی ہے تو اصل مجرموں کو نظر انداز کر کے گھما پھرا کر ملبہ بھٹو پر ڈال دیا

جاتا ہے۔ کیوں؟ کیا مجیب الرحمٰن متحدہ پاکستان چاہتے تھے؟ اگر چاہتے تھے تو کیسا اور اس کیسے میں جنرل حضرات اپنے آپ کو کہاں دیکھ رہے تھے؟ کیا جنرل یحییٰ خان اور ان کے ساتھی مجیب الرحمٰن کے ''تصور پاکستان'' کو قبول کرنے کیلئے تیار تھے اور کیا ذوالفقار علی بھٹو جنرل یحییٰ خان نامی اس مست ہاتھی کو قابو کر سکتے تھے جسے شہنشاہ ایران نے بلا کر روسی صدر پڈگورنی سے ملوایا تاکہ روس پاکستان کی جان چھوڑ دے اور یہ ملک نہ ٹوٹے لیکن موصوف نے نشے میں اسے بھی بے عزت کر دیا۔ بھٹو کا قصور صرف یہ تھا کہ وہ خود کو بچانے کے لئے اس مست ہاتھی کے راستے سے ہٹ گئے یا سر نیچا کر کے خندق میں بیٹھ گئے کہ شاید تقدیر نے پہلے ہی ان کی موت کی لکیر ان کی اپنی پسند کے جنرل کے ہاتھ پر کھینچ رکھی تھی۔

■ ■ ■

15 اکتوبر 2006ء

بھارتی فوج اور مکتی باہنی کی یلغار کے سامنے ہم مشرقی پاکستان میں شکست کھا چکے تھے۔ جب یہ عقلمندی کی گئی کہ مغربی پاکستان کی سرحدوں پر دوسرا محاذ کھول دیا گیا اور ملک کا یہ حصہ بھی خطرے میں پڑ گیا۔ پچھلے دنوں کسی بھارتی جنرل یا سیاستدان کا یہ شکوہ سامنے آ چکا ہے کہ امریکہ نے بھارت کو مغربی پاکستان پر قبضے سے روکا اور اپنا بحری بیڑہ روانہ کر دیا تھا۔ جنگ کے اس مرحلے پر بھٹو صاحب امریکہ میں تھے۔ مشرقی پاکستان میں ہتھیار ڈالنے کے اعلان کے بعد یا ایک آدھ دن پہلے وہ رچرڈ نکسن سے ملے اور کہا جاتا ہے کہ انہی کے دلائل نے امریکہ کے فیصلہ سازوں کو اس بات کا قائل کیا کہ باقی ماندہ پاکستان کا قائم رہنا امریکہ کے مفاد میں ہے۔ اتنی بڑی شکست کے باوجود یحییٰ خان چند بڑھکیں سنانے کیلئے ٹیلی ویژن کی سکرین پر نمودار ہوئے۔ ان کی جسمانی اور زبانی حالت سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ نشے میں دھت ہیں۔ مولانا کوثر نیازی مرحوم سمیت کچھ علماء بھی یہ کہنے کیلئے ٹیلی ویژن سکرین پر لائے گئے کہ یہ شکست اسلامی جنگوں کی تاریخ میں

کوئی نیا سانحہ نہیں۔ یحییٰ خان خود اقتدار میں رہنا چاہتے تھے یا متبادل کے طور پر اپنے نائب جنرل عبدالحمید کو اقتدار دینے پر تلے ہوئے تھے۔ اس مرحلے پر جنرل گل حسن کی قیادت میں اختلاف کرنے والے جنرلوں کی رائے غالب آئی اور بھٹو کو اقتدار دینے کا فیصلہ کروالیا۔ مقصد یہ تھا کہ ایک تو جنرلوں کے خلاف عوام کا غم وغصہ ٹھنڈا کر لیا جائے اور دوسرے فوجی اقتدار میں وقفہ دے کر ایک منتخب اور مقبول سیاستدان کے ذریعے نقصانات کا ازالہ کیا جاسکے۔ جنرل گل حسن اور ان کے ہم خیالوں کے علاوہ فضائیہ کے سربراہ ائر مارشل رحیم بھی بھٹو کے ذریعے ''وقت کی ضرورت'' پوری کرنے کے حق میں تھے۔ میں نے اسے وقت کی ضرورت اس لئے کہا ہے کہ جونہی حالات کچھ سنبھلے اور جنرلوں کا اعتماد بحال ہوا۔ جنرل گل حسن (جنہیں نیا آرمی چیف بنا دیا گیا تھا) اور ائر مارشل رحیم نے بھٹو صاحب کے خلاف بھی وہی پرانا کھیل شروع کر دیا۔ یہ مداخلت زیادہ بڑھی تو بھٹو اور ان کے ساتھیوں نے ان دونوں کو بہت ہی غیر مہذب طریقے سے فارغ کر دیا۔ میں نے اس موضوع پر اپنے پہلے کالم میں لکھا تھا کہ بھٹو اور ان کے خاندان سے فوج کی مخاصمت کی ظاہری وجہ سمجھ نہیں آتی۔ بہر حال ایک وجہ اس سنگین ''سویلین گستاخی یا توہین'' میں تلاش کی جاسکتی ہے۔ اسی قسم کی ایک گستاخی کا نتیجہ میاں نواز شریف کو بھی بھگتنا پڑا۔ خیر بات بھٹو کی ہو رہی ہے۔

طاقت کا اپنا قانون ہوتا ہے اور وہ ہر طرح کے کمالات دکھا سکتا ہے۔ ایسے ہی ایک کمال کے تحت سویلین بھٹو کو صدر کے علاوہ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کا عہدہ بھی دے دیا گیا۔ دنیا بھر کے مارشل لاؤں کی تاریخ میں یہ واقعہ شاید اپنی مثال آپ ہے۔ بھٹو دور کے آغاز میں بعض حلقوں کی طرف سے جنرلوں اور فوج کے نظام پر حملے شروع ہو گئے تھے۔ اس وقت کے وزیر اطلاعات حفیظ پیرزادہ نے ٹیلی ویژن پر ڈھا کہ میں ہتھیار ڈالنے کی فلم چلوائی اور پیپلز پارٹی کے ترجمان اخبار ''مساوات'' میں فوج کے اردلی سسٹم اور عام فوجی کی حالت زار پر کچھ خطوط چھپنے شروع ہوئے تاکہ سیاست میں فوج کی مداخلت کا امکان ہمیشہ کیلئے ختم کر دیا جائے۔ یہ شاید فوج کو ایک ادارے کے طور پر سدھارنے کی سوچی سمجھی مہم تھی (بہر حال

میں اس نکتے پر اصرار نہیں کرنا چاہتا) لیکن بھٹو نے اس ساری مہم کو بکواس قرار دے کر بند کرا دیا۔ جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں۔ بھارت سے دشمنی اور نفرت اور کشمیر کے ساتھ کمٹمنٹ کے حوالے سے ایک طاقتور اور نا قابل تسخیر فوج بھٹو صاحب کی پہلی ترجیح تھی۔ وہ پاکستان کو مسلمان دنیا کا لیڈر اور ایک طرح کا سرپرست دیکھنا چاہتے تھے۔ جس نئے پاکستان کا اقتدار بھٹو کے حصے میں آیا، اس کی بے بسی کے آخری مناظر لاہور کے شہریوں نے اس طرح دیکھے تھے کہ بھارتی طیارے فضاؤں میں دندناتے پھر رہے تھے اور شغل کے طور پر یوں بمباری اور فائرنگ کر رہے تھے جیسے شب برات پر بچے پٹاخے چلاتے ہیں۔ بھٹو نے فوج اور عوام کو شکست خوردگی کی مایوس فضا سے نکالا، فوج کی تنظیم نو ہوئی، اسے نئے اسلحے سے لیس کیا گیا۔ طے شدہ حکمت عملی کے تحت شملہ معاہدہ کے ذریعے مقبوضہ علاقے خالی کرائے اور پھر جنگی قیدیوں کے خاندانوں کے ذریعے دنیا بھر میں مظاہروں وغیرہ کا اہتمام کر کے اس صورتحال کا انسانی پہلو اُجاگر کیا گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ نہ صرف بھارت کو جنگی قیدی رہا کرنے پڑے بلکہ شیخ مجیب الرحمٰن کو کچھ فوجی قیدیوں پر جنگی جرائم کے مقدمے چلانے کے مطالبے سے بھی دستبردار ہونا پڑا۔ بھٹو کا ماسٹر سٹروک لاہور میں منعقد کی جانے والی اسلامی سربراہی کانفرنس تھی جس سے عوام کے قومی تفاخر کو دوبارہ زندگی ملی۔ ائرپورٹ سے لے کر کانفرنس ہال تک مختلف مناظر لائیو ٹیلی کاسٹ کیے گئے۔ لوگوں نے شاہ فیصل سمیت وقت کے تمام نامور مسلمان سربراہوں کو بھٹو کے گرد جمع ہوتے دیکھا۔ ایک ہاری ہوئی قوم نئے ولولے کے ساتھ بیدار ہوئی۔ اس گہما گہمی میں شیخ مجیب الرحمٰن کو لاہور آنے پر آمادہ کیا گیا۔ ائرپورٹ پر آرمی چیف جنرل ٹکا خان کی قیادت میں ایک فوجی دستے نے انہیں سلامی دی۔ بنگلہ دیش تسلیم کر لیا گیا۔ دونوں طرف سے کچھ زخم بھلا دیئے گئے باقی پر مرہم رکھ دیا گیا۔ یہ کمال ذوالفقار بھٹو علی کے سوا کوئی نہیں کر سکتا تھا ورنہ نہ جانے ہم کتنے سال اسی گومگو میں گزار دیتے کہ بنگلہ دیش کو تسلیم کریں یا نہ کریں۔ بھٹو صاحب کے یہ سارے کرشمے ایک مصرعے میں یوں بیان کئے جا سکتے ہیں:

ایسا کہاں سے لائیں کہ تجھ سا کہیں جسے

اگلی کہانی زوال کی ہے جو ہر کمال کے مقدر میں ازل سے لکھا گیا ہے۔ بھٹو صاحب اقتدار کے محاصرے میں آئے اور زمینی حقیقتوں سے بیگانہ ہوتے چلے گئے۔ متفقہ آئین منظور کروایا پھر اس کا حلیہ بگاڑنا شروع کر دیا۔ سیاسی اور صحافتی آزادیاں ناقابل برداشت لگنے لگیں۔ اختلاف کو دشمنی سمجھنے لگے۔ سیاسی قتلوں، گرفتاریوں اور تشدد جیسے سنگین واقعات میں منصف کے بجائے مدعاعلیہ یا ملزم قرار پانے کی کوئی پروانہیں کی۔ کہا جاتا ہے کہ جنرل ضیاء الحق نے ملتان میں قرآن پاک اٹھا کر ان سے اور ان کے خاندان سے وفاداری کا عہد کیا تھا۔ بھٹو صاحب نے سینئر جرنیلوں کو پس پشت ڈال کر انہیں آرمی چیف بنا دیا۔ بھٹو صاحب نے شاید یہ سوچا ہو کہ ضیاء صاحب واحد ارائیں جنرل ہیں اس لئے غیر مشروط اطاعت کرینگے لیکن معاملے کے اس پہلو پر غور نہیں کیا کہ غیر مستحق اور خوشامدی شخص اپنا مقصد حاصل کر لینے کے بعد سب سے خطرناک دشمن ثابت ہوتا ہے۔ ضیاء الحق کچھوے کی چال چلتے رہے اور حکومت کے معاملات میں دخل اندازی بڑھاتے گئے۔ حیات ٹمن اور خدا بخش بچہ جیسے مشیروں نے اپنا کام دکھایا اور بھٹو اختلاف کرنے یا صحیح مشورے دینے والے وزیروں اور مشیروں سے دور ہو گئے خفیہ ایجنسیوں پر انحصار نے انہیں بلوچستان میں مری قبائل پر بمباری جیسے المناک اقدامات کی راہ دکھائی۔ ابھی پچھلے دنوں یہ بات منظر عام پر آئی ہے کہ عطاء اللہ مینگل کے بیٹے کو ضیاء الحق نے قتل کروایا تھا بہرحال مجرم بھٹو صاحب ٹھہرے تھے لیکن انہوں نے صفائی دینے کا تکلف کیا نہ اظہار تعزیت کی رسم پوری کی۔ ایٹمی پروگرام شروع کر کے وہ پہلے ہی امریکہ کو اپنا جانی دشمن بنا چکے تھے اور ہنری کسنجر کی زبان سے یہ دھمکی بھی سن چکے تھے کہ ''تمہیں عبرت کی مثال بنا دیا جائیگا''۔ یہ تھے وہ حالات جن میں بھٹو نے وقت سے پہلے انتخابات کا اعلان کیا۔ پیپلز پارٹی کو ہارنے کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ وہ دو تہائی اکثریت نہ لے سکتی تب بھی واضح اکثریت سے صاف جیت رہی تھی لیکن بھٹو صاحب نے اپنے مخالف امیدوار، جماعت اسلامی کے جان محمد عباسی کو اغوا کرنے کی حماقت پر کوئی اعتراض نہیں کیا اور بیورو کریسی کی حکمت عملی کے مطابق بلا مقابلہ منتخب ہو گئے۔ وہ چاروں وزرائے اعلیٰ اور ایک سینئر

وزیر یعنی صوبیداروں اور ایک نائب صوبیدار کے بلا مقابلہ منتخب ہونے پر بھی خاموش رہے انہوں نے یہ نہیں سوچا کہ پورا الیکشن مشکوک ہو جائیگا۔ پولنگ کے دن تھوڑے مارجن سے جیتنے والوں کے ووٹ بڑھوائے گئے اور شاید ایک درجن کے قریب نشستوں پر اپوزیشن کے امیدواروں کو دھاندلی سے ہرایا گیا۔ اپوزیشن نے جواب میں صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات کا بائیکاٹ کر کے پورے الیکشن کو متنازعہ بنا دیا۔ ملک بھر میں زبردست ایجی ٹیشن شروع ہو گیا۔ ضیاء الحق اپنا کھیل شروع کر چکے تھے۔ چند شہروں میں منی مارشل لاء لگایا گیا۔ جسے ہائیکورٹ نے غیر قانونی قرار دے دیا۔ پھر جنرل ضیاء الحق ہی کے مشورے پر بھٹو صاحب نے شراب اور ریس بند کرنے اور جمعہ کی چھٹی جیسے لاحاصل اقدامات کئے۔ یہ قانون انور عزیز چودھری نے ڈرافٹ کیا تھا اوران کے علم میں تھا کہ تجویز کہاں سے آئی تھی۔ یہ تجویز کنندہ جنرل ضیا ہی تھے۔ خدا خدا کر کے حکومت اور اپوزیشن کے مذاکرات شروع ہوئے 3 جولائی کی رات کو تمام معاملات طے ہو گئے تھے۔ نوابزادہ نصر اللہ خان اور پروفیسر غفور احمد کے بیانات ریکارڈ پر ہیں کہ بھٹو نے اپوزیشن کے تمام مطالبات مان لئے تھے۔ رات گئے بھٹو صاحب نے ہنگامی طور پر ٹیلی ویژن پر آ کر قوم کو بھی یہ خوشخبری سنا دی تھی کہ مفاہمت ہو چکی ہے لیکن جنرل ضیاء الحق مفاہمت کی طرف اس فیصلہ کن پیش قدمی کو شکار کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ وہ صبح کا انتظار کرتے تو مارشل لاء لگانے کا کوئی جواز باقی نہ رہتا. اس دن یا اس رات کوئی نئی قیامت نازل نہیں ہوئی تھی بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ایک نئی صبح طلوع ہوتی نظر آ رہی تھی۔ متفقہ جمہوریت کی صبح، لیکن جنرل ضیاء الحق نے موقع ہاتھ سے جاتا دیکھ کر اپنا آخری وار کر دیا، منہ اندھیرے فوج وزیراعظم ہاؤس میں داخل ہوئی اور یوں ایوب خان اور یحییٰ خان کے وارثوں نے ''بلڈی سویلینز'' سے اپنا حق واپس لے لیا۔

■ ■ ■

16 اکتوبر 2006ء امریکہ نے ڈاکٹر قدیر نیٹ ورک کی مزید تفصیلات جاننے کی خواہش ظاہر کی ہے لیکن چونکہ ہم ایک خودمختار اور آزاد ملک ہیں اور دباؤ میں آتے ہیں، نہ ڈکٹیشن لیتے ہیں صرف گڈ گورننس اور آمریت کے لائسنسوں کی تجدید واشنگٹن سے کرواتے ہیں اس لئے ہم نے امریکی سفیر ریان سی کروکر کا مطالبہ (انتہائی سختی بلکہ حقارت سے) مسترد کر دیا ہے۔ خدا جانے ابھی تک امریکیوں کو یہ خیال کیوں نہیں آیا کہ ذوالفقار علی بھٹو کی قبر کھدوا کر ڈی این اے ٹیسٹ کروانا چاہئے کہ ان کے دماغ میں ایسی کیا خرابی تھی کہ خودکشی پر تل گئے۔ ایٹم بم بنانے کا جنون انہی کو چڑھا تھا۔ وہی ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو ایٹمی ٹیکنالوجی سمیت سمگل کر کے پاکستان لائے تھے۔ شاہ فیصل اور قذافی کو ''ایٹمی پاکستان'' کے فائدے سنا کر ڈالروں سے بھرے ہوئے ہوائی جہاز بھی انہوں نے منگوائے تھے۔ امریکہ انہیں سزائے موت دلوا کر اپنی حسرت پوری کر چکا ہے لیکن ہمارے جہاں پناہوں کو تسلی نہیں ہوئی وہ انہیں پھانسی کے پھندے سے اترنے ہی نہیں دیتے۔ بھٹو صاحب نے کہا تھا ''میں ہر اس گھر میں بستا ہوں جس کی چھت ٹپکتی ہے'' انہیں پھانسی لگے اور دفن ہوئے تقریباً 27 سال ہو گئے ہیں پھر بھی وہ ہر الیکشن میں نمودار ہوتے ہیں اور اپنا انصاف مانگتے ہیں۔ 2002ء کے انتخابات میں بھی پیپلز پارٹی نے دوسری تمام پارٹیوں سے زیادہ ووٹ لئے تھے۔ یہ سب بھٹو کے نام کا کرشمہ ہے۔

ایک نسل چلی گئی، ایک جا رہی ہے۔ ایک درمیانی عمر کی حدوں کو (35'36 سال) چھو چکی ہے اور ایک ابھی جوانی کی سرحد پر پہنچی ہے۔ ہمارے ملک میں تاریخ حکمرانوں کی مرضی کے مطابق لکھی اور شائع کی جاتی ہے۔ جن چار نسلوں کا میں نے ذکر کیا ہے۔ ان میں سے آخری دو نے 1965ء اور اس کے بعد کے واقعات اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھے اس لئے ان کے دلوں اور ذہنوں پر نقش نہیں ہو سکے۔ انہیں تو یہ بھی معلوم نہیں کہ جس جرم کی سزا ڈاکٹر عبدالقدیر کو دی جا رہی ہے اس کے بڑے ملزم (مقدمہ قتل کی طرح) ذوالفقار علی بھٹو تھے اور وہ پہلے ہی اس مقدمہ میں پھانسی پا چکے ہیں۔ ہماری ان نسلوں کے پاس بھٹو کے بارے میں تازہ

ترین معلومات وہی ہیں جو صدر مشرف کی کتاب میں بیان کرائی گئی ہیں۔ ''کرائی گئی'' کا صیغہ میں نے اس لئے استعمال کیا ہے کہ میرا خیال ہے جنرل مشرف نے اپنی یہ کتاب ایوب خان کے سیکرٹری اطلاعات الطاف گوہر کے صاحبزادے ہمایوں گوہر سے لکھوائی تھی جنہیں بھٹو دشمنی ورثے میں ملی ہے۔ ایوب خان کی کتاب ''فرینڈز ناٹ ماسٹرز'' کے مصنف الطاف گوہر اور بھٹو صاحب میں نہیں بنتی تھی۔ وہ وفاقی سیکرٹری اطلاعات تھے اور بھٹو وزیر خارجہ۔ بھٹو پیپلز پارٹی بنا کر مقبول عوامی لیڈر بن گئے اور الطاف گوہر صاحب نے نوکری چھوڑنے کے کچھ عرصہ بعد روزنامہ ''ڈان'' کی ادارت سنبھال لی۔ پرانے غصے نکالنے کیلئے انہوں نے اخبار میں بھٹو پر ذاتی حملے کئے۔ جواب میں وہ گرفتار کر لئے گئے۔ کہا جاتا ہے کہ ان پر بہت سختی کی گئی۔ خیر بعد میں دونوں کے درمیان ''مک مکا'' ہو گیا۔ الطاف گوہر نے بھٹو کے سامنے پکی پکائی روٹی کا ایک منصوبہ پیش کیا۔ بھٹو نے نہ صرف روٹی پلانٹ لگانے کی منظوری دی بلکہ تاوان کے طور پر الطاف گوہر کو 13 کروڑ روپے بھی دلوائے (آج کے زمانے میں یہ رقم 13 ارب سے بھی زیادہ بنتی ہے) جو روٹی پلانٹوں کی اصل لاگت سے کہیں زیادہ تھے۔ بھٹو صاحب خیر سگالی میں آخری حد تک گئے۔ لیکن یہ غیر معیاری اور بد ذائقہ روٹی مارکیٹ میں آئی اور فلاپ ہو گئی۔ بہرحال بھٹو نے مروت اور ''تلافی'' کیلئے الطاف گوہر صاحب کے لکھے ہوئے ایک ایسے بیان پر بھی دستخط کئے جس میں کہا گیا تھا کہ پلانٹ لگا کر ''بھٹو نے اپنا روٹی والا وعدہ پورا کر دیا ہے'' اس دور کے وزیراعظم ہاؤس کے ذرائع کے مطابق اگلے دن جب بھٹو نے ایک انگریزی اخبار کے صفحہ اول پر دو کالم سرخی کے نیچے اپنا یہ بیان پڑھا تو وہ اپنے دوست الطاف گوہر کے اس لطیفے پر دل کھول کر ہنسے۔ ہمایوں گوہر صاحب کو والد سے ملنے والے ورثے میں اس ''زر تاوان'' کا خاصا معقول حصہ ملا ہو گا لیکن ان کے دل میں انتقام کی آگ ابھی تک بجھ نہیں پائی۔

''اِن دی لائن آف فائر'' میں جنرل مشرف نے لکھا ہے کہ وہ بھٹو صاحب کے مداح تھے لیکن ان کے بھائی جاوید نے جو وزیراعلیٰ سرحد کے پرنسپل سیکرٹری تھے۔ انہیں بتایا کہ بھٹو

اچھا آدمی نہیں ہے، ملک تباہ کر دے گا اور بعد میں ان کے بھائی کی یہ رائے درست ثابت ہوئی۔ آگے چل کر تباہی کی جو تفصیل بیان کی گئی ہے اور بھٹو صاحب کیلئے سفاک آمر، فاشسٹ اور منافق جیسے جو خطابات وضع کیے گئے ہیں وہ میرے خیال میں ہمایوں گوہر صاحب کے تخلیقی ذہن کی پیداوار ہیں۔ سب سے پہلا جرم یہ قرار دیا گیا ہے کہ صنعتیں قومی تحویل میں لے لی گئیں۔ نیشنلائزیشن اور پرائیویٹائزیشن دو الگ الگ نظریئے ہیں۔ نیشنلائزیشن عوام کے فائدے میں جاتی ہے کیونکہ روزگار کے مواقع اور معاوضے بڑھتے ہیں، قیمتیں کنٹرول میں رہتی ہیں اور حکومت کو بھی منافع ملتا ہے۔ جبکہ پرائیویٹائزیشن میں صرف سرمایہ دار فائدہ اٹھاتا ہے۔ چینی اور سیمنٹ کے حالیہ بحران اور سکینڈل نجکاری ہی کی برکتوں سے پیدا ہوئے۔ پرائیویٹ سکول اور کالج قومیانے کے حوالے سے بتایا گیا ہے کہ اس سے ہمارے تعلیمی نظام کی تباہی کا آغاز ہوا۔ خیر یہ تباہی اب ترقی میں اس طرح تبدیل ہوئی ہے کہ غریب تو غریب درمیانے طبقے کے بچے بھی بھاری فیس بھرنے کی استطاعت نہ ہونے کی وجہ سے معاشرے کا ٹاٹ بننے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ چند ایک ایڈیٹروں، صحافیوں حتیٰ کہ کارٹونسٹوں سمیت مخالفین کو جیلوں میں ڈالنے کے حوالے سے بھٹو کے جرائم کی کوئی صفائی نہیں پیش کی جا سکتی لیکن کیا یہ جرم ایک ایسے ملک کے اندر برائی میں شمار ہو سکتا ہے جہاں بھٹو دور کے خاتمے کے تقریباً 29 سال بعد ڈاکٹروں اور وکیلوں کو امریکی ایف بی آئی گرفتار کر کے تشدد کا نشانہ بنانے کی مجاز ہے۔ ہم اپنے شہریوں اور سفارت کاروں سمیت غیر ملکی مہمانوں کو امریکی سی آئی اے کے ہاتھ بیچ دیتے ہیں اور وہ گوانتانامو جیسی انسانی حقوق کی جنت میں ہماری خود مختاری کے قصیدے پڑھتے پڑھتے جسمانی اور دماغی مریض بن جاتے ہیں۔ منافقت کی انتہا یہ بیان کی گئی ہے کہ بھٹو نے شراب اور جوئے پر پابندی لگا دی اور اتوار کے بجائے جمعہ کو چھٹی کا دن قرار دے دیا۔ یہ فیصلہ جنرل مشرف کے پیشرو جنرل ضیاء الحق نے اس وقت بھٹو پر مسلط کیا تھا جب وہ اپوزیشن کے ایجی ٹیشن کے سامنے بے بس ہو چکے تھے۔ بھٹو صاحب اتنے ''منافق'' تھے کہ 1970ء اور پھر 1977ء کی انتخابی مہم کے دوران عام جلسوں میں دو بار یہ اعتراف

کرنے سے نہیں ڈرے کہ وہ شراب پیتے ہیں۔ اتوار کی چھٹی میاں نواز شریف نے بحال کر دی تھی۔ ہارس ریسنگ پر جوا، لاہور، کراچی اور راولپنڈی میں کھلے عام ہوتا ہے۔ پولیس پہرہ دیتی اور حفاظت کرتی ہے، البتہ عام آدمی سڑک پر بیٹھ کر پانچ دس روپے کی شرط لگا کر تاش کھیلتا پکڑا جائے تو اسے اندر کر دیا جاتا ہے۔ شراب پر پابندی کی صورتحال یہ ہے کہ 80 فیصد اشرافیہ، امپورٹڈ سکاچ پیتی ہے۔ 6 یا 7 فیصد درمیانہ اور نیم متمول طبقہ عیسائیوں سے مہنگی شراب خرید کر پی لیتا ہے۔ کروڑوں روپے کی بھارتی شراب سرحد سے سمگل ہو کر پاکستان آتی ہے اور ساری کی ساری مسلمان معدوں میں اترتی ہے۔ بھٹو کے اس فیصلے کو منافقت کی انتہا قرار دیا گیا ہے اور وہ بھی کس پابند صوم وصلوۃ نے؟ خیر...... اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا!

کتاب میں کہا گیا ہے کہ بھٹو پاکستان کے بدترین حکمران تھے اور انہوں نے اتنا نقصان پہنچایا کہ ابھی تک ازالہ نہیں ہو سکا۔ جس ملک پر جنرل یحییٰ خان جیسی آفتیں نازل ہو چکی ہوں۔ جنرل ضیاء جیسے کئی چہروں والی بلا گیارہ سال تک مسلط رہی ہو۔ وہاں بھٹو کے خلاف جنرل مشرف کے اس فیصلے سے اس لئے اختلاف نہیں کرنا چاہئے کہ یہاں عوام کوئی معنی نہیں رکھتے۔

اپریل 1979ء میں بھٹو کو قتل کرنے کے بعد جنرل ضیاء الحق نے نومبر میں عام انتخابات کرانے کا اعلان کیا تھا۔ لاہور میں بیگم نصرت بھٹو کے ایک جلسہ عام کی دھمک سے ان پر اتنا لرزہ طاری ہوا کہ مارشل لاء کی تجدید کر کے اسے مزید سخت کرنا پڑا اور پھر اسی خوف سے 1985ء میں غیر جماعتی انتخابات کروانے پڑے۔ 1988ء کے جماعتی انتخابات میں محترمہ بینظیر بھٹو اکثریتی نشستیں جیت کر مرکز اور سندھ میں برسراقتدار آئیں۔ پنجاب میں میاں نواز شریف کو اقتدار ملا۔ اس دور کے آرمی چیف جنرل اسلم بیگ اور آئی ایس آئی کے سربراہ جنرل حمید گل ٹی وی کیمروں کے سامنے یہ اعتراف کر چکے ہیں کہ پیپلز پارٹی کو محدود کرنے کیلئے انتخابات میں ''جھرلو'' کا استعمال کیا گیا تھا۔ کیا اس ملک کے عوام پاگل ہیں؟ کیا وہ اپنے ہی دشمن ہیں۔ کیا وہ غدار ہیں کہ بھٹو کی پارٹی کا دامن ہی نہیں چھوڑتے۔

17 اکتوبر 2006ء

''اِن دی لائن آف فائر'' نے فوج کو ادارے کے طور پر کٹہرے میں لا کھڑا کیا ہے لیکن اس کی حیثیت ملزم کی نہیں، منصف اور ثالث کی ہے۔ اسے اپنا ٹرائل بھی کرنا ہے اور فیصلہ بھی خود ہی سنانا ہے۔ جاوید چودھری نے اپنے گزشتہ کالم میں جنرل پرویز مشرف کی کتاب سے کچھ اقتباسات ترجمہ کر کے نقل کئے تھے۔ جن سے واضح ہوتا ہے کہ ہمارے ملک میں سویلین سیٹ اپ محض ریت کا محل ہے جسے فوج جب چاہے اور جس طرح چاہے مسمار کر سکتی ہے۔ حمود الرحمن کمشن کی رپورٹ شائع ہونے سے بھی فوج کے حوالے سے کئی سوالات اٹھے تھے لیکن ہمارے ملک میں ہر مسئلے کے پیچھے نیا مسئلہ اور بحران کے پیچھے دوسرا بحران قطار باندھے کھڑا رہتا ہے اس لئے حل یا فیصلے موخر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ہم ایک ملک کے طور پر اپنے وجود کا تسلسل اسی طرح قائم رکھ سکتے ہیں کہ بیس تیس یا پچاس سالوں کیلئے کسی ایک نظام کو اپنا لیں اور یہ فیصلہ ہمارے جنرل (جن کے نزدیک آئینی حلف توڑنا بھی ملکی بقاء کیلئے ضروری ہے) اور سیاستدان کسی ایسے اجلاس میں اتفاق رائے سے کریں جس کی صدارت آرمی چیف خود کریں اور منتخب نمائندوں کو انگوٹھا لگانے کے سوا کوئی اختیار نہ ہو۔ پارلیمانی نظام کی کوئی اوقات ہوتی تو بھٹو اور نواز شریف جیسے بھاری عوامی مینڈیٹ والے لیڈروں کا کبھی یہ انجام نہ ہوتا کہ وہ ایک جھٹکے میں وزیراعظم کی انتہائی مضبوط نظر آنے والی کرسی سے مجرموں کی طرح اٹھا لئے جاتے اور پھر قید خانوں، پھانسیوں اور جلا وطنی کے عذاب میں دھکیل دیئے جاتے۔ جنرل ضیاء الحق نے آئین کے بارے میں ٹھیک کہا تھا کہ وہ چند صفحات کی کتاب ہے جسے کسی بھی وقت پھاڑ کر پھینکا جا سکتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ جب تک فوج کو آئین کی باقاعدہ ملکیت نہیں دی جاتی ہم بھول بھلیوں میں بھٹکتے رہیں گے۔ یہ بات طے ہے کہ فوج کے خود مختار اور متوازی نظام کے ہوتے ہوئے خالص پارلیمانی نظام چل ہی نہیں سکتا۔ جب بھی وزیراعظم اور آرمی چیف کے درمیان کوئی تضاد پیدا ہوگا اور وزیراعظم اپنی آئینی طاقت کو بروئے کار لانا چاہے گا تو اسے اقتدار سے باہر جانا پڑے گا۔ 12 اکتوبر 1999ء کی لڑائی جنرلوں اور آئین کے درمیان تھی۔ جس میں آئین کو شکست

ہوئی۔ جولائی 1977ء کا مارشل لاء جنرل ضیاء الحق کے دل میں چھپی ہوئی اس خواہش کا نتیجہ تھا کہ وہ ملک کے مختار کل بنیں اور ریٹائرمنٹ وغیرہ جیسے تفکرات سے آزاد ہو جائیں۔ سویلین نظام کی بے بسی اور بے بضاعتی کا اس سے بڑا مظاہرہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ 5 جولائی 1977ء کی صبح کو ریڈیو پاکستان پر سب سے پہلی خبر یہ چلی کہ حکومت اور اپوزیشن کے درمیان سمجھوتہ ہو گیا ہے اور تمام معاملات طے پا گئے ہیں۔ یہ بلیٹن ابھی درمیان میں تھا کہ خبریں سنانے والے کو اچانک یہ خوشخبری پڑھنی پڑی کہ ملک میں مارشل لاء لگا دیا گیا ہے۔

جنرل مشرف کے بقول بھٹو صاحب بڑے ''فاشسٹ اور بے رحم آمر'' تھے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انہوں نے کسی بحران میں فوج سے مقابلے کیلئے صدام حسین کے نیشنل گارڈز کی طرز پر فیڈرل سکیورٹی فورس (ایف ایس ایف) نام سے اپنے جیالوں کا ایک لشکر تیار کر رکھا تھا۔ اسی ''لشکر'' کے سپہ سالار مسعود محمود بعد میں بھٹو کے خلاف سلطانی گواہ بنے۔ بھٹو صاحب کے ملٹری سیکرٹری میجر جنرل امتیاز فوج کے حلقوں میں بڑے طاقتور سمجھے جاتے تھے۔ ایک فوجی دستہ بھی وزیراعظم ہاؤس کی حفاظت پر مامور تھا لیکن جب ایوان وزیراعظم کی طرف انقلابی فوجی دستے کی پیش قدمی کا پتہ چلا تو بھٹو صاحب اچانک اکیلے ہو گئے۔ جنرل امتیاز نے جی ایچ کیو فون کر کے یس سر اور او کے کہہ کر ریسیور کریڈل پر رکھ دیا اور دکھ بھری نظروں سے بھٹو صاحب کی طرف دیکھا۔ منہ سے ایک لفظ بھی نہیں بولا لیکن بھٹو صاحب خاموشی کے ساتھ کمرے سے اُٹھے اور باہر آ کر لان میں بیٹھ گئے تا کہ جو کچھ بھی ہونے والا ہے اس سے اپنے اہل خانہ کو بچا لیں۔ شاید انہیں شیخ مجیب الرحمٰن اور ان کے خاندان کا حشر یاد آ گیا ہو۔ وہ کچھ دیر کبوتر کی طرح بلی کے انتظار میں بیٹھے رہے۔ پھر فوج ایوان وزیراعظم کے اندر آئی اور انہیں اس طرح ساتھ لے گئی جس طرح چیل چوزے کو اٹھا کر لے جاتی ہے۔ فوجی قیادت نے اس عمل کو ''حفاظتی تحویل'' کا نام دیا۔ بھٹو کو مری لے جا کر نظر بند کر دیا گیا پھر رات کو ٹیلی ویژن پر آ کر جنرل ضیاء الحق نے اعلان کیا کہ پاکستان کا مستقبل جمہوریت ہے اور وہ 90 دن میں منصفانہ الیکشن کروا کے اقتدار منتخب نمائندوں کو منتقل کر دیں گے۔ ابتدائی دنوں میں ضیاء الحق

بھٹو کے احسان (آرمی چیف بنانے والا) کی چبھن اور کسک میں مبتلا رہے اور شاید اقتدار سنبھالنے کے اگلے ہی دن انہوں نے ایرانی اخبار ''کیہان'' کو ایک انٹرویو دیا جس میں بھٹو کو ملک کا ذہین ترین اور مقبول ترین لیڈر تسلیم کیا گیا تھا۔ پھر جوں جوں جنرل ضیاء الحق کو اقتدار کی پائیداری کا اندازہ ہوتا گیا وہ جمہوریت کی ''برکتوں'' سے منحرف ہوتے چلے گئے جسے پہلے دن انہوں نے پاکستان کا مستقبل کہا تھا۔

وزارت عظمیٰ سے برطرفی کے چند دن بعد بھٹو کو حفاظتی تحویل سے رہا کر دیا گیا۔ وہ پہلے کراچی گئے پھر لاہور کا دورہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ جب پرانے ائرپورٹ پر ان کا طیارہ اترا وہاں سے جیل روڈ اور مال روڈ پر نہر کے دونوں پلوں تک انسانوں کے سر ہی سر تھے۔ یہ لاکھوں لوگ اپنی اپنی ٹرانسپورٹ پر یا کئی کئی میل پیدل چل کر ایک معزول وزیراعظم کو دیکھنے آئے تھے۔ ضیاء الحق کو عام انتخابات میں اپنی موت نظر آ رہی تھی اس لئے احمد رضا قصوری کے والد کے قتل کی ایک پرانی ایف آئی آر سیشن کورٹ کے ذریعے ''زندہ'' کی گئی اور مقدمہ لاہور ہائیکورٹ میں منتقل ہو گیا۔ مرحوم مولوی مشتاق حسین چیف جسٹس تھے اور بھٹو کے بدترین اور کھلے دشمن بھی۔ مقدمے کی سماعت کے دوران انہوں نے توہین آمیز رویئے سے گن گن کر اس بات کا بدلہ لیا کہ وہ بھٹو دور میں چیف جسٹس نہیں بن سکے تھے جو ان کا حق تھا۔ لاہور ہائیکورٹ کے فل بنچ نے بھٹو کو متفقہ طور پر سزائے موت سنائی۔ اپیل سپریم کورٹ میں گئی۔ سماعت کے دوران 9 ججوں کے بنچ میں سے 5 غیر پنجابی جج ''ملزم'' کی بریت کے حق میں نظر آ رہے تھے۔ 2 ریٹائرڈ کر دیئے گئے اور پھر 3 غیر پنجابیوں کے مقابلے میں چار پنجابی ججوں نے سزائے موت کی توثیق کر دی۔ درمیانی عرصے کے چند قابل ذکر واقعات یہ ہیں کہ سابق چیئرمین نیشنل پریس ٹرسٹ شیخ حامد محمود مرحوم کے ذریعے بھٹو صاحب کو بینچ میں شامل ایک جج کا یہ پیغام پہنچایا گیا کہ وہ سپریم کورٹ پر اعتماد کا اظہار کر دیں ان کے ساتھ انصاف ہو گا۔ بدلے میں انہوں نے خود پیش ہو کر بیان دینے کی رعایت مانگی۔ جواز راہِ کرم دے دی گئی۔ شیخ حامد محمود کو پیغام دینے والے جج نسیم حسن شاہ تھے جنہوں نے (اپنے سوانح حیات میں)

اقبال کیا ہے کہ سزائے موت کا فیصلہ دباؤ میں آ کر سنایا گیا تھا۔

آخری بیان دینے کیلئے بھٹو سوٹ پہن کر اور ٹائی لگا کر بیان دینے سپریم کورٹ میں آئے تھے۔ ان کی گردن قمیض کے کالر سے نصف رہ چکی تھی لیکن ججوں کی طرف سے بار بار ٹوکے جانے کے باوجود، اس بیان کے بیشتر حصے بھٹو کی علمی، ادبی اور تخلیقی صلاحیتوں کے شہ پارے تھے۔ اس سے پہلے بھٹو کو تقریباً دو سال کا عرصہ پھانسی کی کوٹھری میں گزارنا پڑا تھا۔ کموڈ پھانسی کی کوٹھری میں اندر رکھا رہتا تھا تا کہ بدبو آتی رہے۔ شدید گرمی اور لو میں ان کے سر پر پنکھا پوری رفتار سے چلا دیا جاتا تھا کہ موسم سے لطف اٹھا سکیں۔ عدالتی کارروائی کا سارا ریکارڈ دیکھ لیں۔ بھٹو صاحب نے جیل کے حالات پر کوئی واویلا نہیں کیا۔ سپریم کورٹ سے اپنے آخری خطاب میں انہوں نے اپنی حالت زار کے حوالے سے سرائیکی کے محض چند مصرعے پڑھے جس میں بابا فرید کا یہ دوھڑا بھی شامل تھا۔

دردا ں دی ماری دلڑی علیل اے

سوہنا نئیں سندا دکھاں دی اپیل اے

(درد کا مارا ہوا دل علیل ہے، دکھوں کی اپیل ہے، پیارا نہیں سنتا) (یہاں "سوہنا" (پیارا) اللہ کے معنوں میں استعمال ہوا ہے)

سپریم کورٹ میں آخری بار طلوع ہو کر ہمیشہ کیلئے اندھیروں کی طرف چلا جانے والا ذوالفقار علی بھٹو فیض احمد فیض کے اس شعر کی ایک زندہ مثال تھا۔

جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا وہ شان سلامت رہتی ہے

یہ جان تو آنی جانی ہے، اس جاں کی تو کوئی بات نہیں

یہ تاریخ کی امانتیں ہیں جو بھٹو کے بعد آنے اور جوان ہونے والی نسلوں تک پہنچنی چاہیں۔

■ ■ ■

18 اکتوبر 2006ء

آئی ایس آئی کے سابق سربراہ لیفٹیننٹ جنرل (ر) اسد درانی نے گزشتہ روز ایک سیمینار سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ''پنجاب وفاق کیلئے سنگین خطرہ بن چکا ہے''۔ وقت کے اس موڑ پر بہت سے نئے نئے خیالات اور حقیقتیں سامنے آ رہی ہیں۔ آئی ایس آئی کا ماضی اور حال اندر اور باہر دونوں اطراف سے حملے کی زد میں ہے اگر پنجاب اس کے عام شہریوں کا نام ہے تو وہ بالکل بے گناہ ہے کیونکہ اس صوبے میں عام لوگوں کے انسانی حقوق دوسرے صوبوں سے زیادہ محفوظ ہیں نہ معاشی حالات کو قابل رشک کہا جا سکتا ہے۔ وہ زمانہ گزرے عرصہ ہو چکا ہے جب پنجاب میں بھوک کا مسئلہ نہیں تھا۔ اب تو غربت سے تنگ آ کر کی جانے والی خودکشیوں کی شرح میں ہم دوسرے صوبوں کے برابر آ چکے ہیں۔ ملک کے اشرافیہ میں چاروں صوبوں کے طاقتور عناصر آبادی کے تناسب کے حساب سے تقریباً برابر ہیں اور کمزور طبقوں کا سارا استحصال ''اتفاق رائے'' سے ہوتا ہے لیکن ملزم اکیلا پنجاب بنتا ہے۔ فوج کی صورتحال تھوڑی سی مختلف ہے۔ اس میں پنجاب اور سرحد کی اکثریت ہے۔ اصل شکوہ ہمیشہ جنرلوں کے حوالے سے پھوٹتا ہے اور جنرلوں کی اجتماعی شناخت پنجاب کے ساتھ جڑ گئی ہے۔ ایوب خان پٹھان اور یحیٰی خان ایرانی قزلباش تھے۔ جنرل پرویز مشرف مہاجر تھے لیکن مشرقی پاکستان کے المیہ کا ذمہ دار بھی پنجاب ٹھہرا اور اکبر بگٹی کی موت بھی پنجاب ہی کے کھاتے میں لکھی گئی۔

بھٹو کے قتل کی فرد جرم اس لئے پنجاب پر لگائی جاتی ہے کہ صدر اور آرمی چیف جنرل ضیاء الحق جالندھر کے پنجابی تھے اور انہوں نے ہوس اقتدار کی تسکین کیلئے فوج کو کھل کر اور بے دردی سے استعمال کیا۔ قتل کے مقدمے میں گرفتاری کے بعد بھٹو صاحب کی ضمانت ایک پنجابی جج جسٹس صمدانی نے منظور کر لی تھی۔ بھٹو صاحب وہ رہا ہو کر کراچی چلے گئے پھر ضیاء الحق نے مارشل لاء کے کسی ضابطے کے تحت نیا مقدمہ بنا کر انہیں دوبارہ گرفتار کر لیا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے چھاپہ مار ٹیم کی قیادت فوجی افسران کر رہے تھے۔ جنہوں نے بھٹو سے عام مجرموں سے بدتر سلوک کیا۔ کوٹ لکھپت جیل لاہور اور پھر راولپنڈی جیل میں باقاعدہ فوجی چوکی قائم

کر کے مرحوم کی نگرانی کی جاتی رہی۔ جیل سپرنٹنڈنٹ بلکہ آئی جی کے سارے اختیارات نگران دستے کے کمانڈر نے اپنے ہاتھ میں لے رکھے تھے۔ افسانہ یہ بنایا گیا کہ فلسطینی چھاپہ مار جیل پر حملہ کر کے بھٹو کو اغوا کرنا چاہتے ہیں اور تو اور بھٹو صاحب کو پھانسی گھاٹ تک پہنچانے کا آپریشن بھی فوج کے سپرد تھا۔ جنرل ضیاء الحق نے ہائیکورٹ اور سپریم کورٹ کے پنجابی ججوں کے ذریعے اس قتل کو ''عدالتی'' بنانے کے کامیاب انتظامات کئے تھے لیکن خدا جانے پھر کیوں وہ ہر مرحلے پر فوج کو آگے کرتے رہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ دانستہ طور پر اسے ''عدالتی'' کے بجائے ''فوجی'' قتل کا رنگ دے کر فوج کو اجتماعی طور پر ذمہ دار بنانا چاہتے تھے تاکہ ادارے کے اندر سے کوئی سوال نہ اٹھے۔ پنجاب میں بھٹو کیلئے خودسوزیاں ہوئیں۔ ہزاروں لوگ گرفتار ہوئے، صحافیوں سمیت سینکڑوں افراد نے کوڑے کھائے پھر بھی اس قتل کا ذمہ دار پنجاب ٹھہرا کیونکہ مخصوص مقاصد کے تحت فوج کا دوسرا نام پنجاب رکھا جا چکا ہے اور جنرل ضیاء الحق دانستہ طور پر یہ سہرا پنجاب ہی کے سر باندھنا چاہتے تھے۔

میں پنجابی ہوں۔ بتایا جائے کہ مجھے کیوں ملک توڑنے، بھٹو کو پھانسی دینے، اکبر بگٹی کو ہلاک کرنے اور کراچی میں ہزاروں کی تعداد میں ماورائے عدالت قتلوں کا ملزم سمجھا جاتا ہے۔ 3 اپریل 1977ء کو میں کیمپ جیل لاہور میں تھا۔ مجھے بھٹو کا آخری تحریری عدالتی بیان جو بعد میں ''اگر مجھے قتل کر دیا گیا'' کے عنوان سے شائع ہوا، چھاپنے کے الزام میں سات آٹھ ماہ پہلے گرفتار کر کے سی آئی اے کے چونا منڈی والے بھوت بنگلے اور پھر شاہی قلعے کے عقوبت خانے سے گزار کر جیل میں بھیجا گیا تھا۔ 3 اپریل کی دوپہر ایک اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ کے ذریعے مجھے پتہ چلا کہ بھٹو صاحب کو پھانسی دینے کیلئے رسّے کیمپ جیل سے چلے گئے ہیں۔ افسروں اور اہلکاروں کی رائے یہ تھی کہ پھانسی ہونی ہے تو آج کی رات ہی ہو گی کیونکہ جیل مینوئل کے مطابق اگلے تین دن تک (وجہ مجھے یاد نہیں) پھانسی نہیں دی جا سکتی۔ ایک طرف ساری دنیا بھٹو صاحب کیلئے رحم کی اپیلیں کر رہی تھی دوسری طرف ضیاء الحق کیلئے جلد از جلد معاملہ نبٹانا ضروری ہو چکا تھا۔ اس دور کے بھارتی وزیراعظم مرار جی ڈیسائی نے اسے

پاکستان کا داخلی معاملہ کہہ کر رحم کی اپیل کرنے سے انکار کر دیا تھا اور امریکہ کے صدر جمی کارٹر نے محض دنیا داری کی رسم پوری کی تھی۔ یہاں میں ایک بار پھر یاد دلانا چاہتا ہوں کہ ایٹمی پروگرام شروع کرنے پر بھٹو کو عبرت کی مثال بنانے کی دھمکی ہنری کسنجر کے ذریعے امریکہ ہی کی طرف سے ملی تھی اور یہ سب کچھ اسی کی خواہش کے مطابق ہو رہا تھا۔

مجھے یاد ہے کہ جس رات بھٹو صاحب کو پھانسی دی گئی، میں کیمپ جیل لاہور میں تھا۔ آدھی رات کو تھوڑی دیر کیلئے سرخ آندھی آئی تھی اور مجھے اپنی نانی اماں کی ایک بھولی بسری بات یاد آ گئی تھی جب کبھی سرخ آندھی آتی تھی وہ کہا کرتی تھیں کہ آج ضرور کہیں نہ کہیں کوئی خون ناحق ہو گیا ہے یا ہونے والا ہے۔

■ ■ ■

19 اکتوبر 2006ء

حکومت کے میڈیا منیجر اکثر اوقات بڑی دلچسپ کارروائیاں ڈالتے ہیں۔ کئی بار ایسا ہوتا ہے کہ اخبارات کو کوئی خبر روکنے یا غیر نمایاں کر کے لگانے کی درخواست یا ہدایت دی جاتی ہے اور اگلے دن اس پر حکومت کا ردعمل شہ سرخیوں میں شائع کروا دیا جاتا ہے۔ آج کل یہ پریکٹس عام ہے کہ دن کو نجی ٹی وی چینلوں پر درجن درجن بار چل جانے والی خبر رات کو اخبارات میں رکوانے کی دوڑ لگی ہوتی ہے۔ خبر پر پابندی افواہوں کو جنم دیتی ہے اور افواہ ہر دس میل کے سفر کے بعد نئی نئی شکلیں بدل کر پورے ملک میں ہاہا کار مچا دیتی ہے۔ ایسی ہی کسی حکمت عملی کے تحت 3 اپریل 1979ء کو یہ فیصلہ کیا گیا کہ بھٹو صاحب کی پھانسی کی خبر 4 اپریل کو دن چڑھنے اور تدفین کا طے شدہ عمل مکمل ہونے تک بی بی سی کے ہاتھ نہیں لگنی چاہئے۔ بی بی سی کا نمائندہ مارک ٹیلی اسلام آباد کے ایک ہوٹل میں موجود تھا۔ اس زمانے میں اسے برصغیر کا ''توپ رپورٹر'' سمجھا جاتا تھا۔ اسے خبر سے محروم کرنے کیلئے ایک انتہائی باعزت طریقہ اختیار کیا گیا۔ کسی طرح سے اسے یہ یقین دلایا گیا کہ

آج کی رات کچھ نہیں ہوگا۔ پھر اسلام کے تاریخ ساز مجاہد جنرل ضیاء الحق کے دور حکومت میں اسے رات بھر سرکاری طور پر شراب و شباب میں غرق رکھا گیا۔ وہ اگلے دن بہت دیر سے جاگا جب اسے پتہ چلا کہ اس کے ساتھ ہاتھ ہو گیا ہے تو اس نے حساب برابر کرنے کیلئے کسی طریقے سے پھانسی کے تختے پر بھٹو کے آخری الفاظ معلوم کئے اور بی بی سی کے اگلے بلیٹن کیلئے ایک انتہائی دردناک خبر لکھ بھیجی ''اللہ میری مدد کر، میں بے گناہ ہوں'' بھٹو کے یہ آخری الفاظ گھر گھر میں ماتم برپا کر گئے اور ایک عرصے تک حکومت کیلئے دردسر بنے رہے۔

بھٹو کے قتل پر ملک کے لاکھوں گھروں میں روٹی نہیں پکی۔ سیانے، بچے، عورتیں، نوجوان اور بوڑھے آنسوؤں کے ساتھ روتے دیکھے گئے۔ ملک بھر کے آنسو ایک جگہ جمع ہو سکتے تو لاہور سے گڑھی خدا بخش کے قبرستان تک آنسوؤں کی ایک چھوٹی سی ندی بن جاتی۔ جیلوں میں سزائے موت کیلئے ایک خاص وقت مقرر ہے لیکن بھٹو صاحب کو اس سے دو تین گھنٹے پہلے پھانسی دی گئی تا کہ طے شدہ پروگرام کے مطابق دن نکلنے سے پہلے تدفین عمل میں لائی جا سکے۔ فوج کے جوان ہوائی جہاز میں میت راولپنڈی لے کر گئے اور پھر بھٹو صاحب کے آبائی گھر میں ان کے چچا پیر بخش بھٹو کو منہ دکھا کر تصدیق کروائی اور اپنی نگرانی میں دفن کرا دیا۔ ایک عرصے تک قبر پر پہرہ لگا رہا۔ بھٹو مر گیا، مٹی میں مل گیا لیکن وہ زندہ ہے اور زندہ رہے گا۔ موت ضیاء الحق کو آئی۔ بھٹو کی ہر برسی پر قبر کے گرد میلہ لگتا ہے اور ضیاء الحق کی قبر پر فاتحہ خوانی کرانے کیلئے لوگوں کو ادھر ادھر سے گھیر کر لانا پڑتا ہے۔ بھٹو کے نام پر اب بھی الیکشن میں ''کھمبے'' منتخب ہو جاتے ہیں لیکن ضیاء الحق کے بیٹے اور جانشین اعجاز الحق کو کبھی نواز شریف سے اور کبھی جنرل پرویز مشرف سے ٹکٹ کی بھیک مانگنی پڑتی ہے اور وزارت کیلئے اپنے والد کے عقیدے اور ایمان باسز کے قدموں پر نچھاور کرنے پڑتے ہیں۔ خدا جانے قومی اسمبلی کی رکنیت اور وزارت کتنی بڑی نعمتیں ہیں۔

بھٹو کی پھانسی کے حوالے سے بہت سی کہانیاں ہیں۔ مارک ٹیلی کی کہانی کے مقابلے میں سرکاری کہانی یہ تھی کہ انہوں نے گلے میں پھندے کی چبھن محسوس کر کے تارا مسیح سے

آخری الفاظ یہ کہے تھے (Finish it) ختم کرو۔ بعد میں کئی کہانیاں بنتی رہیں۔ کچھ لوگوں کو وہ چاند میں نظر آتے تھے۔ کچھ لوگ یقین سے کہتے تھے کہ انہیں کچھ سالوں کیلئے کسی خفیہ جگہ پر چھپا دیا گیا ہے۔ کچھ وثوق کے ساتھ یہ خبر سناتے تھے کہ رات کے اندھیرے میں انہیں خاموشی سے کسی مسلمان دوست ملک کے حوالے کر دیا گیا ہے۔ ایک قصہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے موت کی کوٹھری سے پھانسی کے تختے پر جانے سے پہلے وصیت لکھنے کیلئے کاغذ مانگے تھے جو نہیں دیئے گئے پھر آخری خواہش کے طور پر کافی کے ایک کپ کی فرمائش کی۔ جس کی اجازت لینے کیلئے ضیاء الحق سے فون پر رابطے کئے گئے لیکن انہوں نے منع کر دیا۔

قتل کرنے سے پہلے بھٹو صاحب کو مسلسل اذیتیں دی گئیں۔ تارا مسیح کا بیان تھا جب وہ بھٹو صاحب کی نعش پھانسی کے پھندے سے اُتارنے لگا تو ان کی ٹانگیں سوکھ کر دس سالہ بچے جتنی ہو چکی تھیں۔ دوست ممالک بھی بھٹو کیلئے درمیان میں آئے۔ شیخ زائد بن سلطان النہیان نے اپنے معتمد خاص اور مشیر خارجہ خلیفہ احمد الصوبی کے ذریعے پیغام بھیجا کہ وہ ابوظہبی آ جائیں۔ خالد احمد کھرل کے بقول بھٹو صاحب نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ آپ مجھے لے جانا ہی چاہتے ہیں تو کسی ایسی جگہ لے جائیں جہاں خدا اور موت نہ ہو۔

کالموں کے اس سلسلے کو حسن نثار کے سات سال پرانے دو کالموں کے کچھ اقتباسات پر تمام کرنا چاہتا ہوں۔ ہم نثر نگار ہیں اور وہ شاعری لکھتا ہے۔

☆ چند سالہ دور اقتدار میں لاتعداد محاذوں پر لڑنے والا بھٹو

☆ ایٹم بم سے لے کر سٹیل مل تک کی بنیاد رکھنے والا بھٹو

☆ کھاد کے کارخانوں سے لے کر ہیوی میکینکل کمپلیکس بنانے والا بھٹو

☆ کامرہ میں میراج ری بلڈ فیکٹری کا قیام...... کراچی میں ایٹمی بجلی گھر بنانے والا بھٹو

☆ 90 ہزار جنگی قیدی اور پانچ ہزار مربع میل کا علاقہ ہندوستان سے چھڑانے والا بھٹو

☆ اسلامی سربراہی کانفرنس کا انعقاد اور اوپن یونیورسٹیاں ''ایجاد'' کرنے والا بھٹو

☆ چواین لائی اور سوئیکارنو سے لے کر برٹینڈ رسل تک کا فیورٹ بھٹو

☆ آئین سے لے کر شاہراہ قراقرم تک کا معمار بھٹو

☆ پورٹ قاسم کی تعمیر، چشمہ بیراج کی تعمیر سے لے کر فرانس اور کینیڈا کے ساتھ دو ایٹمی معاہدے کرنے والا بھٹو

☆ وزارت مذہبی امور بنانے سے لے کر 17 لاکھ ایکڑ بے زمینوں میں بانٹنے والا بھٹو

اور نجانے کیا کچھ...... ایک بھٹو اور اتنے کام...... یقین نہیں آتا کہ کوئی شخص اتنی محدود مدت میں اتنے محاذ کھول کر اتنے معرکے مار سکتا ہو...... اور پھر سمجھوتہ کئے بغیر تختہ دار پر چڑھ سکتا ہو۔ اپنے ہی چہیتے جرنیل ضیاء الحق کے ہاتھوں مارا گیا...... بے چارہ بدنصیب بھٹو جس نے تاریخ کے ہاتھوں مرنے پر اس بات کو ترجیح دی کہ وہ جرنیلوں کے ہاتھوں مارا جائے، آج تاریخ کیلئے بھی اجنبی ہے اور یہ صرف اپنوں کا کمال ہے۔ ورنہ جو پھانسی گھاٹ سے اترتے ہی اساطیری، دیومالائی اور لیجینڈ ہو گیا تھا، جس کی قبر سوکھنے سے پہلے شاعروں نے خون جگر اور آنسوؤں میں قلم ڈبو کر نوحے لکھے تھے۔ 20 سال کے اندر اندر اٹھتی ہوئی نسلوں کیلئے اس قدر اجنبی کیسے ہو گیا؟ حالانکہ بھٹو کے بدترین حریف بھی بھٹو بننے کی تکلیف میں مبتلا ہیں۔

قائد عوام کو دیکھا تو دل تھام لیا۔ مقبول ترین، مضبوط ترین، محفوظ ترین، ذہین ترین، شاطروں کا شاطر، کھلاڑیوں کا کھلاڑی، کمال کا منصف، بے مثال مقرر کہ دریا کے کنارے تقریر کرے تو پانی میں آگ لگ جائے۔ 18'18 گھنٹے کام کرنے کی عادت، کارناموں کے انبار اور مقابلے میں سب کے سب بالشتیے۔ پھر نہ جانے کیا ہوا کہ وہ جس کی کرسی بہت مضبوط تھی ایک کوٹھری میں اپنے کپڑے اپنے ہاتھوں سے دھوتا دیکھا گیا اور پھر ایسے ہی ایک رات اپنی جان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا۔

سالہا سال تک بظاہر ناقابل تسخیر دکھائی دینے والا، بین الاقوامی شہرت یافتہ اور بلا کا ذہین و فطین، محنتی اور ماہر فن بھٹو اتنی آسانی سے مارا گیا کہ ہم اتنی آسانی سے مچھر بھی نہیں مار سکتے۔ (حسن نثار کا یہ جملہ بہت ہی بے رحم ہے لیکن بھٹو صاحب کے ساتھ جو کچھ بھی ہوا وہ

اس سے کہیں بڑی بے رحمی تھی)

جنرل مشرف نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ وہ محض فاشسٹ، بے رحم اور منافق تھا اور اس نے ملک تباہ کر دیا۔ پاکستان میں فوجی اور غیر فوجی یعنی جمہوری حکومتوں کے اقتدار میں آنے اور رخصت ہونے کا طریق کار ایک دوسرے سے بالکل مختلف رہا ہے۔ پچھلے 58 سال میں چار ناکام بغاوتیں ہوئیں اور چار کامیاب فوجی انقلاب آئے۔ صوفی شاعر میاں محمد بخش کے بقول سول حکومتوں یا حکمرانوں کی حیثیت بس اتنی ہی ہے۔

لسے دا کیہ زور محمد

نس جانا یا رونا

(کمزور کی کیا اوقات؟ وہ بھاگ جاتا ہے یا رونے لگتا ہے) فوجی سربراہوں نے، کسی ایک یا دوسرے بہانے، جس طرح بھی مناسب سمجھا ملک کی تقدیر بدل ڈالی۔ وہ ہر بار باز کی طرح جھپٹے اور سول حکمرانوں کو اپنے پنجوں میں اٹھا کر لے گئے۔ کبھی ایبڈو کر دیا، کبھی پھانسی لگا دی اور کبھی جلاوطن کر کے فیصلہ سنا دیا کہ انہیں اقتدار میں واپس نہیں آنے دیا جائے گا۔ کبھی بی ڈی سسٹم، کبھی غیر جماعتی نظام، کبھی ضلعی نظام اور کبھی باوردی جمہوریت نافذ کر دی۔ وہ آدھا ملک گنوا کر بھی فوجی اعزاز کے ساتھ دفن ہوئے جبکہ عوامی لیڈروں کے جنازے تک اغوا کر لئے گئے۔

جنرل صاحب! ہم ''لسے'' ہیں۔ ملک اور تاریخ پر آپ کا حق چیلنج نہیں کر سکتے۔

■ ■ ■

4 اپریل 2008ء

29 سال پہلے آج ہی کے دن سی ون تھرٹی طیارے میں ایک لاوارث نعش فوج کے پہرے میں سکھر تک اور پھر سڑک کے ذریعے گڑھی خدا بخش کے قبرستان میں لائی گئی تھی۔ یہ ذوالفقار علی بھٹو کی نعش تھی، جو پھانسی کے وقت

بھی اسلامی ملکوں کی کانفرنس کے چیئرمین تھے جنہیں ایک مارشل لاء کے ذریعے وزارت عظمیٰ کے عہدے سے معزول کیا گیا تھا اور پھر لاہور ہائیکورٹ کے ایک بنچ نے، جس کے سربراہ ''ملزم'' کے ذاتی دشمن جسٹس مولوی مشتاق حسین تھے انصاف اور قانون کے تقاضوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے انہیں سزائے موت سنائی۔ سپریم کورٹ میں اپیل دائر ہوئی۔ سماعت شروع ہونے پر 5 غیر پنجابی جج سزائے موت کے خلاف نظر آتے تھے اور چیف جسٹس انوار الحق سمیت چار پنجابی جج، اس وقت کے آرمی چیف اور مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے ایماء پر سزائے موت برقرار رکھنے پر تلے ہوئے تھے، فیصلے سے پہلے سزا کی توثیق کے مخالف دو ججوں کو بنچ سے فارغ کر دیا گیا اور سپریم کورٹ نے 3 کے مقابلے میں 4 ججوں کی اکثریت سے سزائے موت کی توثیق کر دی۔ دنیا بھر کے حکمرانوں اور انسانی حقوق کی تنظیموں کی طرف سے رحم کی اپیلیں آئیں لیکن جنرل ضیاء الحق کے حکم پر بھٹو صاحب کو 3 اور 4 اپریل کی درمیانی رات کو جیل قواعد کی رو سے سزائے موت کیلئے مقرر روایتی وقت سے چند گھنٹے پہلے پھانسی چڑھا دیا گیا اور اعلان جاری ہوا کہ سزائے موت پر عملدرآمد سے پہلے رحم کی تمام اپیلیں مسترد کر دی گئی تھیں۔ یہ اس عظیم الشان لیڈر کیلئے جنرل ضیاء الحق اور ان کے ساتھیوں کا انعام تھا۔ جس نے مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد بھارت سے 90 ہزار جنگی قیدی رہا کروائے، تحصیل شکر گڑھ تقریباً تین چوتھائی اور لاہور کے سرحدی علاقے جو بھارت کے قبضے میں تھے، واپس لئے اور فوج کو نئے سرے سے تعمیر کرنے کے علاوہ پاکستان کا ایٹمی پروگرام شروع کیا۔

بھٹو صاحب عام لوگوں خصوصاً غریبوں کے مقبول ترین لیڈر تھے۔ انہوں نے ملک میں عوامی سیاست کی بنیاد رکھی ہے۔ ضیاء الحق نے انہیں گڑھی خدا بخش میں سپرد خاک کروانے کے بعد یہ فرض کر لیا تھا کہ بھٹوازم کی سیاست مٹی میں مل گئی ہے لیکن محترمہ بینظیر بھٹو کی قیادت میں پیپلز پارٹی نے بھٹو کا علم سرنگوں نہیں ہونے دیا۔ جنرل ضیاء الحق نے نومبر 1979ء میں انتخابات کروانے کا اعلان کیا اور بیگم نصرت بھٹو اور محترمہ بینظیر انتخابی مہم کے لئے نکلیں تو اتنے بڑے بڑے ہجوم سڑکوں اور جلسہ گاہوں میں آئے کہ انتخابات غیر معینہ مدت کیلئے ملتوی کرنے

پڑے۔ گیارہ سال تک قید، کوڑے اور پھانسیاں پیپلز پارٹی کے لیڈروں اور کارکنوں کا مقدر بنی رہیں۔ بیگم نصرت بھٹو اور محترمہ بینظیر کو ملک چھوڑنے پر مجبور ہونا پڑا۔ 10 اپریل 1986ء کو محترمہ بینظیر وطن واپس آئیں تو لاہور کی سڑکوں پر ایک بار پھر ''زندہ ہے بھٹو زندہ ہے'' کا نظارہ دیکھنے میں آیا۔ 1988ء کے انتخابات میں پیپلز پارٹی ملک کی سب سے بڑی پارٹی کے طور پر کامیاب ہوئی اور بینظیر صاحبہ وزیراعظم بن گئیں۔ پھر 1993ء میں انہیں دوسری مرتبہ اقتدار ملا لیکن اپنے شہید والد کی بے گناہی اور عظمت پر قومی اتفاق رائے پیدا نہیں کر سکیں۔ 27 دسمبر 2007ء کو ''زندہ ہے بھٹو زندہ ہے'' کے نعرے لگاتے ہوئے محترمہ نے اسی شہر کو اپنی جان کا نذرانہ پیش کر دیا۔ جہاں بھٹو صاحب کو پھانسی بھی دی گئی۔ اس لمبے سفر میں سینکڑوں ہزاروں افراد نے مصیبتیں جھیلیں اور جانیں قربان کیں لیکن اس کا ثمر یہ ہے کہ عوام نے پیپلز پارٹی کو چوتھی مرتبہ اقتدار دیا ہے۔

ترک وزیراعظم عدنان میندریس کی کہانی ذوالفقار علی بھٹو سے کافی ملتی جلتی ہے وہ دس سال تک وزیراعظم رہے۔ مختلف شعبوں میں اصلاحات کیں۔ ترکی نے ان کے دور میں صنعتی اور تجارتی میدانوں میں غیر معمولی ترقی کی۔ 27 مئی 1960ء کو ایک فوجی بغاوت میں عدنان میندریس کا تختہ الٹ دیا گیا پھر دو وزیروں سمیت انہیں پھانسی لگا دی گئی۔ بھٹو صاحب نے اس سانحہ کی تفصیل بینظیر کی سالگرہ پر اپنے خط، جو انہوں نے اپنی موت سے چند ماہ پہلے لکھا تھا، یوں بیان کی تھی:۔

''ترکی میں فوجی جنتا نے یہ خیال کیا کہ ترکی کے مسائل کا ایک آسان اور سادہ حل عدنان میندریس کو تختہ دار پر لٹکا دینا ہے۔ ستمبر 1960ء میں ایوب خان نے مجھے ترکی بھیجا تھا کہ میں فوجی جنتا سے میندریس کو سزائے موت سے بچانے کی اپیل کروں۔ میں نے جنرل گرسل سے طویل ملاقات کی تھی۔ جس میں ترکی کے وزیر خارجہ سلیم بھی موجود تھے۔ جنرل گرسل نے مجھ سے کہا کہ ترکی کے مسائل میندریس کو سزائے موت پر عمل کرنے سے حل ہو جائیں گے۔ عجیب بات یہ ہے کہ انہوں نے یہ بھی کہا کہ اناطولیہ کے کچھ حصوں میں موت کی

سزا پر شدید تشدد پر مبنی ردعمل ہوگا لیکن پھر چند مہینوں میں ہر شخص میندریس کو بھول جائے گا۔ میں نے جنرل گرسل سے کہا کہ ترکی کے مسائل میندریس کو پھانسی دینے سے حل نہیں ہوں گے بلکہ ترکی کے اصل مسائل کی ابتدا ہی میندریس کی پھانسی سے ہوگی۔ میں نے اُن سے کہا کہ ترکی کے عوام اس پھانسی کو چند مہینوں میں نہیں بھلائیں گے۔ اس کے برعکس ہر ترک کئی نسلوں تک پھانسی کے گناہ کا احساس اپنے ساتھ لئے پھرے گا۔ میں نے جنرل گرسل سے کہا کہ میندریس تو پھانسی پا کر لافانی ہو جائے گا اور اس سانحہ کا گہرا داغ ترکی کے چہرے پر نمودار ہو جائے گا اور اس کی سیاست میں ایک گہری تفریق پیدا ہو جائے گی۔ جب میں جنرل گرسل کے دفتر سے روانہ ہوا تو سلیم سارپر نے اپنا ہاتھ میرے کاندھے پر رکھتے ہوئے کہا کہ ”اللہ تمہارا بھلا کرے گا“۔

ضیاء الحق کا مارشل لاء اور بھٹو صاحب کی پھانسی کے نتائج بھگتتے بھگتتے ہمیں آج 29 سال ہو گئے ہیں۔ 18 فروری 2008ء کو قوم نے پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ (ن) سمیت ایسی سیاسی جماعتوں کو بھاری اکثریت سے کامیاب کرایا ہے جو ملک میں جمہوریت اور انصاف لانے کا تہیہ کئے ہوئے ہیں۔ ملک کی تاریخ میں پہلی مرتبہ قومی سیاسی مفاہمت کی ایک خوبصورت فضا نے نہ صرف جنم لیا ہے بلکہ وہ ہر گزرتے دن کے ساتھ مضبوط ہوتی جا رہی ہے۔ یہ سب ان خوابوں کی تعبیر ہے جو 4 اپریل 1979ء کو پھانسی چڑھنے سے پہلے بھٹو صاحب نے دیکھے ہونگے، پھر شاہنواز، مرتضٰی اور بینظیر بھٹو کی آنکھوں میں اس وقت تک زندہ رہے جب تک موت کے اندھیروں نے انہیں چھپا نہیں دیا۔ گڑھی خدا بخش کے قبرستان میں یہ چاروں بھٹو آج بھی زندہ ہیں اور راہ دکھانے والی مشعلوں کی طرح جل رہے ہیں۔

■ ■ ■

7 جنوری 2010ء

جن ملکوں میں تاریخ کا پہیہ ایک ہی دائرے میں گھومتا رہتا ہے اور جو وقت کے ساتھ آگے نہیں بڑھتے وہاں ماضی کبھی مرتا ہے نہ بھولی ہوئی کہانی بنتا ہے۔ وہ ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کی طرح بار بار زندہ ہو کر سامنے آتا ہے۔ پاکستان کے اس سابق وزیراعظم کی حکومت کا تختہ 5 جولائی 1977ء کو الٹا گیا تھا جب وہ ایک متنازعہ بھاری مینڈیٹ لیکر دوسری مرتبہ ملک کے وزیراعظم بنے تھے۔ 4 اپریل 1979ء کو انہیں پھانسی دے دی گئی۔

بھٹو صاحب کی پھانسی کے وقت پیپلز پارٹی کی مخالف بیشتر جماعتیں حکومت کی حامی تھیں۔ حکومت کے اندر اور باہر تمام قابل ذکر جماعتوں اور اکثر لیڈروں کو یقین تھا کہ بھٹو کی موت کے ساتھ پیپلز پارٹی تتر بتر ہو جائے گی اور وہ اس کے ووٹ بنک میں سے اپنا اپنا حصہ لوٹ کر آئندہ جمہوریت میں برسر اقتدار آ جائیں گے۔ لیکن انہیں یہ اندازہ نہیں تھا کہ جنرل ضیاء الحق نے آئین توڑ کر مارشل لاء اس لئے نہیں لگایا تھا نہ ہی آئینی وزیراعظم کو اس لئے پھانسی دی تھی کہ اقتدار پی این اے کے سپرد کر دیں۔ اس دور کے سیاستدانوں کو اپنی زندگی بھٹو کی موت میں نظر آتی تھی۔ اس وقت کے امیر جماعت اسلامی میاں طفیل محمد تو مستقبل کے حوالے سے اتنے پر جوش تھے کہ پھانسی سے ایک دن پہلے انہوں نے ضیاء الحق سے ملاقات کی اور فرمایا کہ بھٹو کی پھانسی سے غیر یقینی صورتحال ختم ہو جائیگی اور ساری قوم راہِ راست پر آ جائیگی۔ پیپلز پارٹی کے بیشتر لیڈروں اور کارکنوں کا خیال تھا کہ بھٹو صاحب بین الاقوامی شہرت کے حامل ہیں۔ وہ سمجھتے تھے کہ بہت سارے سربراہان مملکت بھٹو صاحب کے ذاتی دوست ہیں اس لئے ضیاء الحق انہیں قتل نہیں کریں گے۔ شاید انہوں نے یہ سوچا ہو کہ عوام بہت بڑی طاقت ہیں اور آخری فتح انہی کی ہوتی ہے۔ کچھ حضرات کو یہ خوش فہمی بھی تھی کہ لوگ جیل توڑ کر انہیں چھڑا لیں گے یا کوئی ہیلی کاپٹر اچانک آ کر بھٹو کو جیل سے نکال کر لے جائیگا۔ لیکن ہمارے جیسے ملکوں کی حقیقت یہ ہے کہ آخری فتح ہمیشہ عوام نہیں، فوجی آمروں کی ہوتی ہے۔ بھٹو کو مار دیا گیا۔ ضیاء الحق نے گیارہ سال حکومت کی، غیر جماعتی انتخابات کرائے اور اپنی

مرضی کے سیاستدان اور لیڈر تخلیق کیے۔ 17 اگست 1988ء کو وہ طیارے کے حادثے میں جاں بحق ہو گئے۔ ضیاء الحق اور ان کے ساتھی اپنے حساب کتاب سے پیپلز پارٹی کو دفن کر چکے تھے۔ لیکن 1988ء کے الیکشن میں اسٹیبلشمنٹ کی دھاندلی کے باوجود انہیں ماننا پڑا کہ بھٹو زندہ ہے۔

محترمہ بینظیر کی شہادت کے بعد ذوالفقار علی بھٹو ایک نئے روپ میں دوبارہ زندہ ہوئے۔ وہ نفرت کی علامت سمجھے جاتے تھے اب پیپلز پارٹی کے دشمن بھی انہیں شہید تسلیم کرتے ہیں۔ ذوالفقار علی بھٹو اور محترمہ بینظیر کی حکمت عملی میں کوئی خاص فرق نہیں تھا۔ بھٹو امریکہ کی رضامندی سے اقتدار میں آئے۔ حکم عدولی کی اور لڑتے ہوئے مارے گئے۔ محترمہ نے امریکہ اور اسٹیبلشمنٹ سے مفاہمت کا سیاسی کھیل کھیلا لیکن پاکستان آ کر معاہدہ توڑ دیا۔ باپ راولپنڈی جیل میں پھانسی چڑھا اور بیٹی لیاقت باغ راولپنڈی میں قتل کر دی گئی۔

عوامی سیاست کی یہ کہانی 1968ء میں شروع ہوئی تھی۔ جیلوں اور عقوبت میں بند رہی۔ پھانسی گھاٹوں اور قتل گاہوں سے گزرتی ہوئی 2008ء کے عام انتخابات میں پھر حکمرانی جیت گئی۔

بھٹو صاحب کے دورِ اقتدار میں عوام اور ملک کے لئے شاندار کارناموں کے بعد یہ پارٹی پچھلے دو ادوار میں ہر قسم کی سازشوں اور کردار کشی کے سبب عوام کو کچھ نہیں دے سکی۔ اپنے چوتھے دور میں بھی میڈیا اور غیر منتخب قوتوں نے اس کے گرد گھیرا تنگ کر رکھا ہے لیکن اس کے باوجود وہ محروم طبقوں کی تمناؤں کا مرکز ہے۔ اس کا ووٹ بینک قائم ہے۔ اب بھی اس طرح کے کرشمے دکھاتی ہے کہ عدلیہ اور میڈیا کی ملامت کے طوفانوں میں اس کا جمشید دستی نوابزادہ نصراللہ خان کے بیٹے اور غلام مصطفیٰ کھر سے ضمنی الیکشن جیت جاتا ہے۔ چالیس سال تک اس پر پھانسیوں، کوڑوں اور بدنامیوں کے پہاڑ توڑے گئے لیکن بھٹو کا کرشمہ نہیں ٹوٹا۔

■ ■ ■

کھوبہ

23 اگست 2009ء

سپریم کورٹ آف پاکستان سابق صدر اور آرمی چیف جنرل (ر) پرویز مشرف کے 3 نومبر کے اقدامات کو غیر آئینی قرار دے چکی ہے۔ جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ وہ غداری کے مرتکب ہوئے۔ اس جرم کی سزا دلوانے کیلئے ایک سادہ سی کارروائی باقی ہے۔ حکومت مقدمہ درج کروائے اور انہیں گرفتار کرا کے پاکستان لے آئے۔ امریکی لاتعلقی ظاہر کر چکے ہیں اور وزیراعظم صاحب کی زبانی یہ خبر بھی ریکارڈ پر آ چکی ہے کہ فوج نے اپنے اس ریٹائرڈ جنرل کو اللہ، عدالتوں اور عوام کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا ہے۔ کوئی کمی رہ گئی ہے تو صرف اتنی سی کہ وزیراعظم یوسف رضا گیلانی صاحب اُسی شان اور طنطنہ سے اسی طرح کا ایک جملہ کہہ دیں جیسا انہوں نے وزیراعظم منتخب ہونے کے بعد قومی اسمبلی میں اپنی پہلی تقریر میں کہا تھا۔ وہ جملہ یہ تھا ''میں حکم دیتا ہوں کہ گرفتار ججوں کو رہا کر دیا جائے'' اب انہیں صرف یہ کہنا ہے میں حکم دیتا ہوں ''پرویز مشرف پر غداری کا مقدمہ درج کر کے اُنہیں کیفر کردار تک پہنچایا جائے'' یہ ایک سطری حکم جاری کرنے کیلئے انہیں اتنا ہی وقت لگے گا اور اتنی ہی زحمت ہو گی جو اخباری رپورٹوں کی بنیاد پر سچ یا جھوٹ کی تحقیقات کرائے بغیر اپنے پریس سیکرٹری زاہد بشیر سے لیکر چیئرمین پاکستان سٹیل ملز اور پھر ان کے قائم مقام کو برطرف کرنے کیلئے اٹھانی پڑی۔ قومی سلامتی کے مشیر محمود علی درانی کا ''جھٹکا'' اس سے بھی زیادہ شاندار تھا۔ درانی صاحب صرف ایک سیکنڈ میں ایک ٹیلی وژن چینل کی سکرین پر برطرف ہوئے۔ پٹرولیم کے مشیر ڈاکٹر عاصم کو تو جو صدر زرداری کے خاص دوست سمجھے جاتے ہیں اور

پچھلے دنوں چین کے دورے میں اُن کے ساتھ تھے، گیلانی صاحب نے محض پھونک مار کر اُڑا دیا۔

پچھلے دنوں پیپلز پارٹی کے شریک چیئرمین اور صدر مملکت آصف علی زرداری نے ایک نجی ٹی وی کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا تھا کہ گیلانی صاحب ایک طاقتور وزیراعظم ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ 17ویں ترمیم مردہ ہو چکی ہے۔ اس وقت شاید انہیں یہ یاد نہیں رہا کہ اس ترمیم کی ایک ''افادیت'' اب بھی باقی ہے اور وہ یہ کہ بدترین قسم کی الزام تراشی کرنی ہو تو موجودہ وفاقی سیٹ اپ کو ''زرداری حکومت'' کہا جاتا ہے اور قصیدہ نویسی کا کوئی موقع آن پڑے تو حکومت کے اس سیٹ اپ کا نام تبدیل ہو کر خودبخود ''گیلانی حکومت'' بن جاتا ہے۔ میرا اصل موضوع کچھ اور تھا۔ بات دوسری طرف نکل گئی۔ کسی نہ کسی وجہ سے دور حاضر کا اہم ترین مسئلہ (ہمارے ہر دور حاضر اور ہر اہم ترین مسئلے کی مدت ہمیشہ ہفتے دو ہفتے پر محیط ہوتی ہے) یہ ہے کہ 3 نومبر کو یعنی محض 3 نومبر کو 1973ء کا وہ مقدس آئین توڑنے پر پرویز مشرف کی سرکوبی ہونی چاہئے جسے 4 جولائی 1977ء کو جنرل ضیاء الحق نے توڑا اور یہاں تک کہہ دیا کہ آئین کیا ہے چار صفحے کی ایک کتاب، جسے میں جب چاہوں پھاڑ کر پھینک سکتا ہوں۔ احتیاطاً یہ بھی یاد دلاتا چلوں کہ انہوں نے سیاستدانوں کے بارے میں یہ رائے بھی ظاہر کی تھی کہ میں اشارہ کروں تو وہ دُمیں ہلاتے ہوئے میرے پاس چلے آئیں گے۔ ضیاالحق نے اپنی پی سی او سپریم کورٹ کی اتھارٹی پر آئین میں اپنی مرضی کی ترامیم کیں اور پھر غیر جماعتی انتخابی ہیرا پھیری کے بعد منتخب سیاستدانوں کی دُمیں اپنے مارشل لاء کے ساتھ باندھ کر ایک ایسی پارلیمنٹ تشکیل دی جس نے ان کے ہر غیر آئینی اقدام کی توثیق کر دی۔ 12 اکتوبر 1999ء کو جنرل مشرف نے آئین توڑا۔ جنرل مشرف نے اپنی پی سی او سپریم کورٹ سے فیصلہ لیا۔ پھر ایک ایسی اسمبلی سے آئین میں ترمیم منظور کروالی جس کے سرکاری ارکان کی اکثریت کو دھاندلی سے جتوایا گیا تھا۔ اُن کی اتحادی جماعتوں کو اس کے باوجود قومی اسمبلی میں سادہ اکثریت نہیں ملی اور انہیں پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر منتخب ہونے والے ارکان کو توڑ کر جمالی حکومت بنانی پڑی۔

3 نومبر کے اقدامات جنرل پرویز مشرف نے انہی اختیارات کے تحت اٹھائے جنہیں ایک سپریم کورٹ بیگم نصرت بھٹو کیس میں اور دوسری ظفر علی شاہ کیس میں پارلیمنٹ سے منظوری کی پابندی لگائے بغیر آرمی چیف کا غیر مشروط استحقاق قرار دے چکی تھی۔ پھر پرویز مشرف نے اپنی دوسری پی سی او سپریم کورٹ سے 3 نومبر اور اُس کے بعد کے اقدامات کے حق میں فیصلہ بھی لیا، وہ دوسری مدت کیلئے صدر بھی بن گئے لیکن وردی اتار چکے تھے اس لئے انتخابات کے مثبت نتائج حاصل کرنے میں ناکام رہے۔

آج کی صورت حال یہ ہے کہ صدارت سے مستعفی ہونے کے بعد مشرف صاحب لندن میں بیٹھے ہیں۔ ان کی ''اپنی پارٹی'' معقول تعداد میں نشستیں جیتنے کے باوجود تتر بتر ہوگئی تھی، اس لئے فی الحال خود کو ''ون مین'' پارٹی کہہ سکتے ہیں۔ پیپلز پارٹی اور ن لیگ سمیت اُن کی مخالف سیاسی جماعتوں کے ارکان کی تعداد دو تہائی سے بھی زیادہ ہے۔ سید یوسف رضا گیلانی پیپلز پارٹی کی طرف سے وزارت عظمیٰ کیلئے نامزد ہوئے تھے لیکن جب سے اُنہوں نے ایوان صدر اور اپنے پارٹی چیف کی ''اوقات'' بے نقاب کرنی شروع کی ہے، وہ پیپلز پارٹی سے زیادہ مسلم لیگ (ن) کے ہیرو ہیں۔ میاں نواز شریف کو وہ علانیہ طور پر اپنا پسندیدہ ترین سیاستدان قرار دیتے ہیں اور ان کی عوامی مقبولیت اور سیاسی طاقت کو بھی تسلیم کرتے ہیں۔ اپنے پارٹی چیئرمین کو انہوں نے اتنا ''چھوٹا'' کر دیا ہے کہ تقریروں میں ان کا نام لینا بھی معیوب سمجھتے ہیں۔ یہ رویہ مخصوص مقاصد پر مبنی میڈیا کی ایک مہم کے اثرات کا نتیجہ بھی ہوسکتا ہے اور ان سروے رپورٹوں کا بھی جن میں گیلانی صاحب کی مقبولیت کے گراف کو پارٹی اور اس کے لیڈر سے الگ کرکے بہت بلند ظاہر کیا جاتا ہے۔ گیلانی صاحب آئین کے مطابق اپنے اختیارات بلاشرکت غیرے استعمال کرتے ہیں اور ملکی سیاست کی اس فرسودہ روایت کو مسترد کر چکے ہیں جس کے تحت مسلم لیگ (ن)، اے این پی، ایم کیو ایم اور جمعیت علمائے اسلام (ف) سمیت تقریباً تمام سیاسی جماعتوں کے نامزد حکمران اپنی اپنی پارٹیوں کے سربراہوں کا فیصلہ سازی میں ''غیر آئینی'' حق مانتے ہیں۔

گیلانی صاحب صدر زرداری اور پارٹی کی سینٹرل ایگزیکٹو کمیٹی سے فاصلہ پیدا کر کے میاں نواز شریف کی سرپرستی کو فوقیت دے رہے ہیں۔ اسٹیبلشمنٹ کے ہاتھوں تقریباً دس سالہ خواری کے باوجود میاں نواز شریف کافی حد تک بے خوف ہیں جبکہ پیپلز پارٹی خصوصاً بھٹو صاحب کی جانشین قیادت 4 اپریل 1979ء والے خوف سے اب تک چھٹکارا نہیں پا سکی اور کوشش کرتی ہے کہ اندرونی اور بیرونی معاملات پر ''مفاہمت'' کی پالیسی پر قائم رہے۔

وزیراعظم مختار کل چیف ایگزیکٹو بننا چاہتے تھے اور بہت ہی تھوڑے عرصے میں ایسا کر دکھایا۔ اس لئے میاں نواز شریف یہ سوچنے میں حق بجانب ہیں کہ گیلانی صاحب ''کن فیکون'' کہنے کی پوزیشن میں ہیں۔ اب معاملہ یہ ہے کہ نہ صرف قائد حزب اختلاف چودھری نثار علی بلکہ خود میاں نواز شریف بار بار پرویز مشرف کے خلاف غداری کا مقدمہ چلانے کا مطالبہ کر رہے ہیں اور یہ اختیار مکمل طور پر گیلانی صاحب کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ اس قسم کی کسی کارروائی کے ساتھ کوئی ایسی آئینی شرط منسلک نہیں کہ اسے قومی اسمبلی کی متفقہ قرارداد کے بغیر استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ حیرت انگیز طور پر وزیراعظم مختلف جواز بنا کر اس مطالبے پر عملدرآمد نہیں کر رہے۔ ان کی ایک دلیل یہ ہے کہ جب پرویز مشرف صدارت سے مستعفی ہو گئے تو میں (صدقے اس ''میں'' کے جو پارلیمنٹ سے بھی اونچی ہے) نے انہیں معاف کر دیا تھا۔ دوسرا جواز اس سے بھی زیادہ دلچسپ ہے۔ گیلانی صاحب نے بتایا کہ وہ انتقام اس لئے پسند نہیں کرتے کہ پارٹی چیئرمین بلاول بھٹو زرداری (صدر آصف زرداری کے فرمانبردار صاحبزادے) یہ فرمان جاری کر چکے ہیں کہ جمہوریت بہترین انتقام ہے۔

پیپلز پارٹی نے ابھی تک کوئی ایسی پالیسی جاری نہیں کی جس میں وزیراعظم کو ہدایت کی گئی ہو کہ وہ پرویز مشرف پر غداری کا مقدمہ چلانے کا حکم نہ دیں۔ ویسے بھی اس وقت پارٹی اور حکومت دو الگ الگ وجود ہیں۔ یوسف رضا گیلانی اپنے اختیارات میں کسی کی مداخلت قبول نہیں کرتے۔ وہ تاریخ بنانا چاہتے ہیں جس کا ایک سنہری موقع ان کے اپنے ہاتھوں میں ہے۔ وہ مشرف کو ابھی اور اسی وقت گرفتار کروا سکتے ہیں لیکن مسئلے کی نوعیت ایسی ہے کہ اسے

دوسری بدنامیوں کی طرح زرداری صاحب کے کھاتے میں نہیں ڈالا جا سکتا وہ ان بھٹوز کا تسلسل ہیں جو گڑھی خدا بخش کی چار قبروں میں سوئے پڑے ہیں۔ یہ چاروں اسٹیبلشمنٹ کے انتقام کا نشانہ بنے اور اپنے وارثوں کیلئے یہ سبق چھوڑ گئے کہ پاکستان جیسے ملکوں میں سیاست ہر وقت ''شکاریوں'' کے نشانے پر رہتی ہے۔ پرویز مشرف پر مقدمہ چلانے کا فیصلہ صدر آصف زرداری کے اختیار میں ہوتا اور وہ انکار کر دیتے تو بات سمجھ میں آ سکتی تھی لیکن گیلانی صاحب کی حد تک اس لئے سمجھ نہیں آتی کہ 3 اور 4 اپریل 1979ء کی درمیانی رات کو جنم لینے والا خوف ان کے دل و دماغ تک تو پہنچ ہی نہیں سکا تھا۔ وہ اس وقت دوسری طرف تھے۔ وزیراعظم صاحب کو اپنی کولیشن ٹوٹنے کا ڈر ہے تو مسلم لیگ (ن) انہیں موجودہ صورتحال سے کہیں زیادہ طاقتور وزیراعظم بنا سکتی ہے۔ فوج سے کسی قسم کا خوف اس لئے نہیں ہونا چاہیے کہ وہ خود یہ کہہ چکے ہیں کہ یہ ادارہ مشرف کے ٹرائل میں رکاوٹ نہیں ڈالے گا۔ کوئی شبہ ہے تو میاں نواز شریف کا یہ بیان ان کا حوصلہ قائم رکھنے کیلئے کافی ہے جس میں مسلم لیگ (ن) کے قائد اور ملک کے مقبول لیڈر نے صاف لفظوں میں فوج کو وارننگ دی تھی کہ وہ مشرف سے ناطہ توڑ لے۔ شرم الشیخ کے دورے کے دوران گیلانی صاحب کی ایک مفصل گفتگو بھی شائع (ابھی تک تردید نہیں آئی) ہو چکی ہے کہ انہیں (وزیراعظم کو) ''اپنے طور پر'' ہی قومی اسمبلی میں ارکان کی سادہ اکثریت کی حمایت، حاصل ہے۔ اس جمہوری سیٹ اپ کے آغاز میں کئی مشکل مرحلے آئے، زرداری صاحب نے گیلانی صاحب کو امیدوار نامزد کرنے کے بعد متفقہ وزیراعظم بنوانے کیلئے 3 نومبر کی عدلیہ کی بحالی کیلئے ایک ایسا معاہدہ بھی کیا جو اس وقت بعض طاقتور سٹیک ہولڈرز کو قبول نہیں تھا۔ اس معاہدے سے انحراف سمیت ہر بدنامی زرداری صاحب نے خوشدلی سے سمیٹی۔

■ ■ ■

25 اگست 2009ء

پرویز مشرف پر غداری کے مقدمے کے سلسلے میں وزیر اعظم یوسف رضا گیلانی کے اختلافی موقف پر میاں نواز شریف کی مایوسی تو اخباری سرخیوں کی زینت بن چکی ہے۔ کچھ ''زبانی خبر رساں ایجنسیوں'' نے میاں صاحب سے یہ جملہ بھی منسوب کیا ہے کہ ''زرداری نے مجھ سے معاہدے توڑے تھے، گیلانی نے میرا دل توڑ دیا ہے'' پیپلز پارٹی کی بعد از بھٹو سیاست اور میاں نواز شریف کے سیاسی اور ذاتی رویوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ وہ ظلم بے وفائی یا بے عزتی کو سیاسی مصلحت، مفاہمت یا قصہ ماضی سمجھ کر بھولنے کے قائل نہیں ہیں اور ایسے لوگوں کے ساتھ حساب برابر کرنے کا موقع ملنے پر (جنہوں نے اُن کے ساتھ نا انصافی یا زیادتی کی ہو) یہ پروانہیں کرتے کہ اُنہیں قیمت کیا ادا کرنی پڑے گی۔ جنرل جہانگیر کرامت سے استعفٰی لینے کے بعد اُنہوں نے جنرل پرویز مشرف کو کسی میرٹ یا استحقاق کی بنیاد پر نہیں، اپنے صوابدیدی اختیارات کے تحت آرمی چیف کا عہدہ دیا۔ حالانکہ اسی طرح (بھٹو اور جنرل ضیاء الحق) کے ایک احسان کا دردناک انجام اُن کے سامنے تھا۔ آرمی چیف کا عہدہ ہر فوجی افسر کا خواب ہوتا ہے۔ اخبارات کو پرویز مشرف صاحب کی جو پہلی تصویر جاری ہوئی اُس میں اُن کا آدھا چہرہ نظر آ رہا تھا۔ غالباً اس وقت تک ریکارڈ میں وہی ایک تصویر موجود تھی۔ میں اُس زمانے میں ''نوائے وقت'' میں تھا۔ مجھے اپنے اُس کولیگ کا نام یاد نہیں جس نے وہ تصویر دیکھ کر کہا جس جنرل نے ابھی تک اپنے پورے چہرے کی تصویر بھی نہیں بنوائی وہ انتہائی خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ میاں صاحب نے جنرل مشرف کی زندگی کے ذاتی (شاموں اور راتوں کے مشاغل کے ضمن میں) اور لسانی (اُردو سپیکنگ) پہلوؤں کو معیار بنا کر وہی غلطی کی ہے جو بھٹو صاحب نے ضیاء الحق کے سلسلے میں کی تھی۔ مرحوم جنرل ضیاء کا تعلق غیر مارشل علاقے اور ایک ایسی برادری سے تھا جس میں جنگجویانہ رویے نہیں پائے جاتے۔ میرے اس کولیگ نے یہ بھی یاد دلایا کہ نواز شریف، جنرل جہانگیر کرامت سے استعفٰی لیکر پہلے ہی فوج کے خلاف اُس ''جرم'' کے مرتکب ہو چکے ہیں جو ذوالفقار علی بھٹو نے جنرل گل حسن اور ایئر مارشل رحیم کو (بذریعہ اغوا

اور حبس بیجا) برطرف کر کے کیا تھا۔ اس لئے انہوں نے خطرات کو دعوت دے دی ہے۔

مشرف صاحب نے آرمی چیف کا عہدہ سنبھالا۔ ابتدا میں ہی اپنے ساتھی جنرلوں اور افسروں میں جنرل کرامت کے حوالے سے بلڈی سویلینز کی ''دیدہ دلیری'' کیخلاف فضا ہموار کی اور فیصلہ کرا لیا کہ آئندہ ایسی کوئی حرکت برداشت نہیں کی جائے گی۔ مشرف صاحب نے اپنے مسل دکھانے شروع کئے تو میاں شہباز شریف اور چوہدری نثار علی نے انہیں راضی رکھنے کیلئے جوائنٹ چیفس آف سٹاف کا عہدہ بھی دلوا دیا۔ نواز شریف کا ایجنڈا موٹر وے جیسے منصوبے تھے۔ وہ تنازعہ کشمیر کا کوئی قابل قبول حل نکال کر ترقی کے سفر کو تیز کرنا چاہتے تھے۔ اسی تناظر میں وہ گراؤنڈ ورک کر کے اس وقت کے بھارتی وزیراعظم واجپائی کو لاہور میں مینار پاکستان پر لے آئے تھے اور باہمی تعلقات کی نوعیت اتنی خوشگوار بنا دی تھی کہ مسئلہ کشمیر کا کوئی نہ کوئی حل نکلنے کا راستہ ہموار ہوتا نظر آنے لگا تھا۔ اس عمل کو سبوتاژ کرنے کیلئے جنرل پرویز مشرف نے کارگل کا ایڈونچر کر ڈالا۔ میاں صاحب نے صدر کلنٹن کی مدد سے ملک اور فوج کو تو رسوائی سے بچا لیا لیکن وہ جنرل پرویز مشرف کو (جو سول کپڑوں میں وزیراعظم کو ''واشنگٹن مشن'' کیلئے رخصت کرنے ائرپورٹ پر حاضر تھے) برطرف کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔

ہمارے ملک میں ایوان صدر اور ایوان وزیراعظم، دونوں عملی طور پر فوج کی تحویل میں ہوتے ہیں۔ حکمرانوں کی نقل و حرکت اور گفتگو (ٹیلی فونوں سمیت) کچھ خفیہ نہیں ہوتا۔ ملاقاتیں ملٹری سیکرٹری کے علم میں ہوتی ہیں یہی وجہ ہے کہ جب میاں نواز شریف نے جنرل مشرف کو فارغ کرنے کی کارروائی شروع کی۔ راولپنڈی میں موجود جنرل عزیز وغیرہ پہلے ہی جوابی اقدامات کیلئے تیار تھے۔ آرمی چیف ابھی فضا میں تھے کہ ٹرپل ون بریگیڈ نے دو تہائی اکثریت والا یہ جمہوری تختہ الٹ دیا۔ وزیراعظم کو گرفتاری، اندھیرے کمروں میں نظر بندی، عدالتوں میں خواری، ہوائی جہاز میں ہتھکڑیوں کو نشستوں سے باندھنے سمیت ہر اس تذلیل سے گزارا گیا جو ممکن ہو سکتی تھی۔ شہباز شریف اور نواز شریف کے بڑے صاحبزادے حسین نواز سمیت کچھ مزید ملزم بھی طیارہ سازش کیس میں گرفتار ہوئے لیکن عدالت نے انہیں بے

گناہ قرار دے دیا۔ میاں نواز شریف کو عمر قید سنائی گئی اٹک قلعے کی یہ قید تنہائی اُن کے لئے ناقابل برداشت تھی، اس لئے انہیں پرویز مشرف کی مشروط رہائی قبول کرنی پڑی۔ میاں صاحب کے سعودی اور لبنانی دوست درمیان میں پڑے۔ دس سالہ جلا وطنی کے معاہدے کے عوض سزا معاف کروائی اور معافی نامہ لکھوایا اور جدہ لے گئے۔ بھٹو صاحب بھی اس طرح کی لچک دکھانے پر آمادہ ہوتے تو پھانسی سے بچ سکتے تھے لیکن وہ اور طرح کے آدمی تھے۔ انہوں نے اپنا حساب تاریخ اور عوام پر چھوڑ دیا تھا لیکن میاں نواز شریف زندہ رہ کر اپنا حساب کتاب اپنے ہاتھوں سے برابر کرنا چاہتے تھے اس لئے انہوں نے خاندان سمیت جلا وطنی قبول کر لی۔ انہوں نے سعودی عرب میں رہ کر اپنے آپ کو میڈیا اور سیاست میں زندہ رکھا۔ عام انتخابات کے موقع پر وطن واپس آئے تو محترمہ بینظیر بھٹو کی شہادت کے بعد دہشت گردی کے شدید خطرات کے باوجود میاں شہباز شریف کے ساتھ مل کر مختصر وقت میں اتنی موثر انتخابی مہم چلائی کہ مسلم لیگ پنجاب میں سب سے بڑی اور مرکز میں دوسری بڑی پارٹی بن کر اسمبلیوں میں پہنچ گئی۔ وہ خود قومی اسمبلی کے عام رکن بھی نہیں ہیں لیکن موجودہ سیٹ اپ کا چوتھا ستون ہیں۔

جلا وطنی کے زمانے میں انہوں نے محترمہ بینظیر کے ساتھ ایک میثاق جمہوریت پر بھی دستخط کئے تھے۔ 18 فروری 2008ء کے انتخابات کے بعد پیپلز پارٹی کے ساتھ مخلوط حکومت میں بھی شریک ہوئے۔ سید یوسف رضا گیلانی کو متفقہ وزیراعظم منتخب کروایا اور اپنے وزیروں کو کالی پٹیاں باندھ کر صدر مشرف سے حلف لینے کی اجازت بھی دی۔ آخر میں معزول ججوں کی بحالی سے پہلے صدر مشرف کے مواخذے میں اپنا حصہ ڈالا۔ پرویز مشرف کے مستعفی ہونے کے بعد بھی جب جج بحال نہیں ہوئے اور آصف زرداری دو تہائی سے بھی زائد اکثریت لیکر ایوان صدر میں پہنچ گئے۔ عام خیال یہ تھا کہ کھیل ختم ہو چکا ہے اور پیپلز پارٹی اب پنجاب پر بھی قبضہ کر لے گی لیکن یہ محض ایک خام خیالی تھی۔

میاں نواز شریف کی ظاہری سادگی ہمیشہ ان کے مخالفوں کو اس غلط فہمی میں مبتلا کر دیتی ہے کہ وہ سیاسی داؤ پیچ کھیلنے کے بجائے سیدھی ''ٹکر'' مارتے ہیں اور اپنے ہی زور پر چت ہو

جاتے ہیں۔ اسی حوالے سے 15 مارچ کے لانگ مارچ کا اعلان بظاہر ایک ٹکر ہی لگتا تھا۔ اسے ناکام بنانے کیلئے ایک عدالتی فیصلے کے ذریعے پنجاب میں گورنر راج لگایا جا چکا تھا۔ تمام انتظامی افسر تبدیل کر دیئے گئے تھے۔ کامیابی کا کوئی امکان نظر نہیں آتا تھا۔ میاں صاحب کے اپنے سوا شاید ہی کسی کو معلوم ہو کہ وہ کھیل کے اصل پتے پہلے ہی اپنے ہاتھ میں لے چکے ہیں۔ وہ ڈھائی سو کارکنوں کے ساتھ ماڈل ٹاؤن سے نکلے۔ پولیس راستے سے ہٹ گئی۔ پھر ان کا جلوس بڑھتا گیا۔ ابھی راوی کا پل بھی پار نہیں ہوا تھا کہ ایوان صدر شکست تسلیم کرنے پر مجبور ہو گیا۔ جسٹس افتخار محمد چودھری سمیت معزول ججوں کی بحالی کے فیصلے کی اطلاع آرمی چیف جنرل کیانی نے ٹیلی فون پر چودھری اعتزاز احسن کو سنائی۔ جو گوجرانوالہ میں میاں نواز شریف کے ساتھ موجود تھے۔ جلوس واپس چلا گیا لیکن کھیل بدل چکا تھا۔

آزاد عدلیہ این آر او کھول کر بیٹھ گئی۔ میاں نواز شریف اور میڈیا نے بھی ایوان صدر کو نشانے پر رکھ لیا۔

■ ■ ■

26 اگست 2009ء

ذوالفقار علی بھٹو نے 1973ء کے آئین میں صدارت کو ایک نمائشی عہدہ بنا کر وزیراعظم ہاؤس کو اقتدار کا واحد مرکز بنا دیا تھا۔ انہیں اپنی عوامی مقبولیت پر بہت ناز تھا لیکن وہ آرمی چیف کا انتخاب کرتے وقت غلطی کھا گئے۔ بے رعب، بے تاثر اور عام سی شکل وصورت کے حامل افراد کو عام طور پر بچپن، سکول اور پھر سروس میں اہمیت نہیں دی جاتی۔ لیکن ایسے لوگ اس کمی اور اپنی شخصیت کے سرسری پن کو منافقانہ تابعداری، وفاداری اور خوشامد کے ذریعے پورا کر لیتے ہیں۔ بعد میں اگر وہ کسی حادثے یا معجزے سے طاقت حاصل کر لیں تو ماضی میں اپنی تحقیر کا حساب ضرور چکاتے ہیں۔ جنرل ضیاء الحق نے کور کمانڈر ملتان تھے جب انہوں نے قرآن پاک کو درمیان میں لا کر بھٹو

صاحب کے قصیدے پڑھے اور وفاداری کا عہد کیا، انعام میں میرٹ اور سنیارٹی کو نظر انداز کر کے بھٹو صاحب نے انہیں آرمی چیف کا عہدہ لگا دیا۔ ممکن ہے پھانسی کی کوٹھڑی میں بیٹھ کر یا تختہ دار پر کھڑے ہو کر بھٹو صاحب جیسا شاندار اور تاریخ ساز آدمی یہ سوچ کر کچھ زیادہ ہی آزردہ ہوا ہو کہ وہ مارا بھی جا رہا ہے تو کتنے چھوٹے آدمی کے ہاتھوں۔ 73ء کے آئین میں سویلین طاقت کا واحد مرکز ایوان وزیراعظم تھا۔ جنرل ضیاء الحق نے تقریباً 8 سال ملک اور آئین کو مکمل طور پر اپنے قبضے میں رکھا پھر باوردی جمہوریت متعارف کرائی۔ غیر جماعتی انتخابات کروائے قومی اسمبلی سے 8ویں ترمیم منظور کروائی اور آرٹیکل 58ٹو (بی) کے تحت جونیجو حکومت برطرف کر دی۔ ان کی وفات کے بعد دو صدور غلام اسحاق خان اور فاروق لغاری نے آئین کی یہ دفعہ مزید تین بار استعمال کی۔ ان دونوں کو میاں نواز شریف نے اقتدار سے نکالا اور 58ٹو (بی) کو آئین سے خارج کروا کے ''دو بادشاہی'' نظام ختم کر دیا لیکن ان پر تیسری بادشاہت حملہ آور ہو گئی۔ فوجی حکومتوں میں ساری طاقت ایک ہاتھ میں ہوتی ہے لیکن جونہی جمہوری نظام آتا ہے اقتدار تین مراکز میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ حکومت ہمیشہ فوج اور عدلیہ کے درمیان سینڈوچ بن کر رہ جاتی ہے کا مزید المیہ یہ ہے کہ الیکٹرانک میڈیا چوتھی ایسی طاقت بن چکا ہے جس کی مقبولیت یا ریٹنگ کا انحصار اس بات پر ہے کہ حکومت کے خلاف نفرت بڑھانے کی دوڑ میں وہ سب سے آگے رہے۔ اب تو امریکہ اور برطانیہ بھی ہماری ''حکومت بازی'' میں فریق ہیں۔ گویا جمہوریت کی نئی تعریف یہ ہے کہ ووٹ عوام دیتے ہیں۔ حکومتیں بنانے، چلانے اور گرانے والے کوئی اور ہوتے ہیں۔

میں اس موضوع کی طرف واپس آتا ہوں جو یہ ہے کہ میاں نواز شریف کا سیاسی سفر کہاں سے شروع ہوا اور کہاں تک آیا۔ وہ اسٹیبلشمنٹ کے ہاتھوں استعمال ہوئے یا انہوں نے اسے اپنا آلہ کار بنایا اور اب وہ اسٹیبلشمنٹ کو چیلنج کرنے کے اس مقام پر کھڑے ہیں کہ جنرل پرویز مشرف کو نشان عبرت بنانے کے معاملے پر کوئی لچک دکھانے کیلئے تیار نہیں۔ میاں صاحب نے اپنا سیاسی سفر انتہائی دھیمی رفتار سے شروع کیا تھا۔ وہ لیفٹیننٹ جنرل غلام جیلانی

کی گورنری کے زمانے میں پنجاب کے وزیر خزانہ بنے۔ جنرل ضیاء الحق اور گورنر جیلانی کی گڈ بکس میں جگہ بنائی۔ اپنے مضبوط حریفوں سے پنجاب کی وزارت اعلیٰ چھینی۔ وہ غیر جماعتی انتخابات کے بعد تشکیل پانے والی مسلم لیگ کا حصہ تھے۔ جنرل ضیا نے اسمبلیاں توڑیں تو میاں صاحب نے دوبارہ وزارت اعلیٰ قبول کرنے میں عار نہیں سمجھی۔ اسے بے اصولی کہا جاتا ہے لیکن یہ اس سیاسی سفر کی ایک منزل تھی۔ جو وہ اپنے لئے منتخب کر چکے تھے۔ وہ اقتدار میں رہ کر اپنے لئے عوام اور میڈیا میں راستے بناتے رہے۔ فضائی حادثے میں ضیاء الحق کی موت سے پہلے ہی وہ پنجاب میں پیپلز پارٹی کے طاقتور حریف بن چکے تھے۔ غلام اسحاق، فوج اور ایجنسیوں نے 1988ء کے عام انتخابات میں پیپلز پارٹی کو کٹ ٹو سائز کرنے کیلئے آئی جے آئی بنائی جس میں بڑے بڑے لیڈر شامل تھے۔ لیکن میاں صاحب نے سیاست اور میڈیا وار میں اپنے آپ کو محترمہ بینظیر بھٹو کا اصل مدمقابل منوایا۔ قومی اسمبلی کیلئے پیپلز پارٹی نے پنجاب میں زیادہ نشستیں جیتی تھیں لیکن صوبائی انتخابات میں نواز شریف پیپلز پارٹی سے زیادہ نشستیں جیت گئے۔ آزاد امیدواروں کو راتوں رات اپنے ساتھ ملا لیا اور وفاق میں پیپلز پارٹی کی حکومت بننے سے پہلے پنجاب میں اپنی حکومت بنا لی۔ اُنہوں نے صدر غلام اسحاق خان، فوج اور خفیہ ایجنسیوں کو مسلسل اپنے ہاتھ میں رکھا۔ وفاق میں متحدہ اپوزیشن بنوا کر بینظیر حکومت کے خلاف تحریک عدم اعتماد پیش کروائی لیکن کہا جاتا ہے کہ آخر میں ہاتھ کھینچ لیا۔ شاید اس لئے کہ وہ جتوئی کو وزیر اعظم بننے دیتے تو ان کا اپنا سیاسی کھیل خراب ہو سکتا تھا۔ 1990ء میں صدر غلام اسحاق خان نے کرپشن کے انتہائی گھناؤنے الزامات لگا کر محترمہ بینظیر کی حکومت برطرف کر دی۔ اس سے پہلے ایک طے شدہ ظالمانہ میڈیا مہم کے ذریعے محترمہ اور آصف زرداری کو اتنا بدنام کیا جا چکا تھا کہ آئی جے آئی کے مقابلے میں پیپلز پارٹی کافی کمزور ہو چکی تھی۔ غلام اسحاق خان نے برطرفی کی تقریر میں محترمہ اور آصف زرداری پر اتنے گھناؤنے الزامات عائد کئے کہ بعد میں جب وہ میاں نواز شریف کے خلاف محترمہ کے اتحادی بنے تو ان کی اپنی اخلاقی ساکھ شرمناک حد تک گر گئی۔ آئی جے آئی نے عملی طور پر یہ الیکشن

مصطفٰی جتوئی کی قیادت میں لڑا۔ وہ وزارت عظمٰی کے امیدوار بھی تھے لیکن منتخب ہونے والوں کی اکثریت میاں نواز شریف کے ساتھ تھی اور اس جیت کا سہرا بھی انہی کے سر تھا اس لئے انہوں نے جتوئی صاحب کو فارغ کر دیا اور خود وزیراعظم بن گئے۔ صدر غلام اسحاق، اسٹیبلشمنٹ اور ایجنسیوں نے یقیناً اسے اپنا کارنامہ سمجھا ہوگا اور یہ سوچ کر خوش ہوئے ہوں گے کہ وہ پیپلز پارٹی کو باہر نکال کر ایک ایسا آلہ کار اقتدار میں لے آئے ہیں جو ہمیشہ ان کے تابع رہے گا۔ یہ سوچ بہت جلد غلط ثابت ہوگئی۔ میاں نواز شریف نے اپنے آئینی اختیارات میں مداخلت کے خلاف مزاحمت شروع کر دی۔ انہیں استعمال کرنے کے دعویدار یہ دیکھ کر پریشان رہ گئے کہ نواز شریف کے اندر چھپا ہوا ایک اینٹی اسٹیبلشمنٹ جمہوری سیاستدان الٹا انہیں اپنے لئے استعمال کر گیا ہے۔ نواز شریف 58(2)بی ختم کرنا چاہتے تھے اور غلام اسحاق خان کے ساتھ دوسری مدت کیلئے صدارت کا پیشگی وعدہ کرنے سے بھی انکاری تھے۔ غصہ کھا کر صدر غلام اسحاق نے پیپلز پارٹی کو ساتھ ملایا اور میاں صاحب کی حکومت برطرف کر دی۔ وہ سپریم کورٹ سے بحال ہو کر واپس آئے لیکن غلام اسحاق کے ساتھ مفاہمت اور ورکنگ ریلیشن شپ کا امکان مسترد کر دیا۔ آرمی چیف عبدالوحید کاکڑ نے مداخلت کی۔ یہ معاملہ صدر اور وزیراعظم دونوں کے استعفے پر ختم ہوا۔ اس لڑائی نے نواز شریف کو دائیں بازو کا ایک ایسا عوامی لیڈر بنا دیا جس کا اپنا ووٹ بنک اور جس کی مسلم لیگ کی شناخت نواز (ن) تھی۔ نئے انتخابات میں پیپلز پارٹی پہلے سے زیادہ اکثریت کے ساتھ اقتدار میں واپس آئی۔ ایوان صدر میں اپنے سب سے زیادہ قابل اعتماد ساتھی فاروق لغاری کو صدر بنایا جن کی نیاز مندی اتنی بے مثال تھی کہ محترمہ بینظیر کی گاڑی کے دروازے کے ساتھ لٹک کر میلوں کا سفر طے کرتے ہوئے تھکتے تھے نہ ہی کسی قسم کی ہتک محسوس کرتے تھے۔ پیپلز پارٹی 5 سال کیلئے اپنی حکومت مضبوط کر کے مطمئن ہو چکی تھی لیکن نواز شریف مایوس نہیں ہوئے۔ انہوں نے اس حکومت کی مضبوطی کو ہی کمزوری میں تبدیل کیا۔ مہران بنک سکینڈل کے حوالے سے تحریک چلا کر لغاری صاحب کو دباؤ میں لائے۔ ایوان صدر کی شان وشوکت نے ''بھائی فاروق'' کو یاد دلایا کہ وہ

''مسٹر پریذیڈنٹ'' ہیں اور محترمہ بینظیر ان کی لیڈر نہیں، 58ٹو بی والے آئین کے تحت وزیراعظم ہیں۔ صدر اور وزیراعظم میں چھوٹے چھوٹے اختلافات بڑھ کر نا قابل برداشت ہوتے گئے۔ میاں نواز شریف نے وہی کھیل کھیلا جو محترمہ بینظیر نے غلام اسحاق خان کے ساتھ مل کر کھیلا تھا۔ لغاری صاحب نے نواز شریف سے مفاہمت کر کے اپنی ہی پارٹی کی حکومت توڑ دی۔ جونیئر پوزیشن سے ترقی پا کر چیف جسٹس آف پاکستان بننے والے مسٹر جسٹس سجاد علی شاہ پہلے ہی پیپلز پارٹی حکومت سے ناراض ہو چکے تھے۔ انہوں نے بینظیر صاحبہ کی برطرفی کے خلاف پٹیشن کی سماعت کو اتنا طول دیا کہ پیپلز پارٹی کو انتخابی مہم چلانے کا مناسب وقت بھی نہیں ملا۔ وہ بدترین شکست سے دوچار ہوئی۔ محترمہ بینظیر اور آصف زرداری پہلے صدر اور پھر سیف الرحمٰن کے بنائے ہوئے مقدموں میں پھنس کر بدنام اور دربدر ہونے پر مجبور ہو گئے۔ حکومت برطرف کرنے کے فوراً بعد صدر لغاری کے حکم پر فوج نے لاہور کے گورنر ہاؤس میں گھس کر آصف زرداری کو اٹھایا۔ ہیلی کاپٹر میں ڈالا اور کسی نامعلوم جگہ پر لے گئی۔ وہاں سے انہیں جیل بھیجا گیا۔ مقدمے چلتے رہے کوئی ساڑھے آٹھ سال بعد آصف علی زرداری مشرف دور میں ضمانت پر رہا ہوئے اور علاج کیلئے امریکہ چلے گئے۔ 1996ء کے آخر میں جب میاں نواز شریف دو تہائی اکثریت سے جیت کر دوبارہ وزیراعظم بنے۔ انہوں نے وہ خطرات ملیامیٹ کرنے میں دیر نہیں لگائی جو ماضی کی تین حکومتوں کو پیش آئے تھے۔ انہوں نے سب سے پہلے صدر کے اختیارات ختم کئے پھر لغاری صاحب کو ایوان صدر سے اور چیف جسٹس سجاد علی شاہ کو سپریم کورٹ سے رخصت کیا۔ دونوں محترمہ بینظیر کو دھوکہ دے کر میاں نواز شریف کی نظر میں اپنا اپنا اعتبار کھو چکے تھے۔ جنرل پرویز مشرف والا قصہ میں پہلے ہی بیان کر چکا ہوں۔ مشرف سے پہلے اسلم بیگ، عبدالوحید کاکڑ، آصف نواز اور جہانگیر کرامت سے بھی میاں نواز شریف کی نہیں بنی تھی کیونکہ وہ فوج کو بالادست سمجھنے کے بجائے اپنی سول حکومت کا ماتحت ادارہ سمجھتے اور اس کی مداخلت قبول نہیں کرتے تھے۔

میاں نواز شریف کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ منتقم مزاج آدمی ہیں، غلطیاں

معاف نہیں کرتے اور ہلکی سی سرکشی پر بھی بدظن ہو جاتے ہیں۔ پیپلز پارٹی بھٹو خاندان اور مسلم لیگ (ن) میاں نواز شریف کی ذات کے گرد گھومتی ہے۔ اکثر نشستوں پر ہار جیت کا فیصلہ دونوں پارٹیوں کے ٹکٹ کا مرہون منت ہوتا ہے۔ لیکن ماضی میں محترمہ بینظیر اور اب آصف علی زرداری کے برعکس میاں نواز شریف اہم حکومتی عہدے دیتے وقت ایسے لوگوں کا انتخاب نہیں کرتے جو بعد میں ''بروٹس'' ثابت ہوں۔ میاں صاحب پہلی مرتبہ وزیراعظم بنے تو غلام حیدر وائیں مرحوم کو پنجاب کا وزیراعلیٰ بنایا۔ دوسری بار آئے تو پنجاب اپنے سگے بھائی شہباز شریف کے سپرد کر دیا اور فاروق لغاری کو ہٹانے کے بعد صدارت کیلئے رفیق تارڑ کو چنا۔

■ ■ ■

27 اگست 2009ء

4 اپریل 1979ء کا المیہ بیگم نصرت بھٹو، محترمہ بینظیر اور پیپلز پارٹی پر گزرا۔ جس وقت بھٹو صاحب کو تختہ دار پر لے جایا جا رہا تھا۔ دونوں ماں بیٹیاں سہالہ ریسٹ ہاؤس میں قید تھیں اور اس کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکی تھیں کہ جی بھر کر رو لیں۔ قید سے رہائی کے بعد انہوں نے جنرل ضیاء الحق کے خلاف فیصلہ کن عوامی جدوجہد شروع کرنا چاہی لیکن پارٹی کارکنوں اور حامیوں کو ملکی تاریخ کے سفاک ترین جنرل کا سامنا تھا۔ جس کی ''انسانیت'' میں پھانسیوں، ٹارچر سیلوں، قید کی لمبی سزاؤں اور کوڑوں سمیت ہر ظلم کی گنجائش تھی۔ جو عورتوں کے معاملے میں بھی اتنا مرد مومن تھا کہ جب بیگم نصرت بھٹو نے لاہور سٹیڈیم میں ایک کرکٹ میچ کے دوران احتجاجی نعرے لگوائے، ان کے سر پر سیدھی لاٹھی ماری گئی اور وہ لہولہان ہوگئیں۔ بینظیر صاحبہ کو مچھ جیل کی قید سمیت انتہائی بے شرمی سے ہر قسم کے تشدد اور تذلیل کا نشانہ بنایا گیا۔ دونوں ماں بیٹیوں نے باری باری جلاوطنی اختیار کر لی لیکن ملک کی ایک بہت بڑی اکثریت کا بھٹو صاحب سے ''عشق'' اتنا سچا تھا کہ پارٹی کارکن اور عوام ماریں کھاتے، قیدیں کاٹتے، پھانسیوں پر لٹکتے رہے اور پیپلز

پارٹی کو اتنی طاقت کے ساتھ زندہ رکھا کہ 10 اپریل 1986ء کو جب محترمہ بینظیر جلاوطنی ختم کر کے لاہور ائرپورٹ پر اتریں تو پیپلز پارٹی کو قصہ ماضی سمجھنے والے ششدر اور خوفزدہ ہو گئے تھے۔ محترمہ نے لاہور کا رخ کرنے سے پہلے عمرہ اور واشنگٹن یاترا دونوں ''ضروری'' فریضے ادا کئے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ انہیں دونوں جگہ سے سلامتی کی ضمانت دی گئی تھی جس کے عوض انہیں بھی کچھ وعدے اور یقین دہانیاں کرنا پڑی تھیں۔ انہوں نے جونیجو حکومت کی حد تک فوجی قبضے کو تسلیم کر کے جنرل ضیاء الحق کا معاملہ شاید امریکہ پر چھوڑ دیا تھا اور پھر 1988ء کے الیکشن میں سب سے بڑی پارٹی کے طور پر جیتنے کے باوجود اسٹیبلشمنٹ کا جونیئر حکومتی پارٹنر بننا قبول کر لیا۔ مفاہمت کی یہ پالیسی پیپلز پارٹی کی موجودہ حکومت کا بھی منشور ہے۔ بھٹو صاحب نے بہادری سے موت کے خوف اور پھر موت کا مقابلہ کیا تھا لیکن ان کی پھانسی اتنی بڑی دہشت بن کر ان کے وارثوں کے اعصاب پر سوار ہوئی کہ محترمہ بینظیر نے وزارت عظمیٰ کا حلف اٹھانے کے بعد اس غلام اسحاق خان کے ساتھ نماز ادا کی، جو 4 اپریل 1979ء کے المیہ کے محرک، مخبر اور معمار سمجھے جاتے تھے اور پھر تمغہ جمہوریت اس مرزا اسلم بیگ کو دیا جو ضیاء الحق کے جانشین تھے اور عام انتخابات میں خود محترمہ کے بقول پیپلز پارٹی کے خلاف سلیکٹو رگنگ کے شریک ڈائریکٹر پروڈیوسر تھے اور غلام اسحاق کے اس نقطہ نظر سے اتفاق کرتے تھے کہ بھٹو خاندان اور پیپلز پارٹی ملک کیلئے سکیورٹی رسک ہیں۔ بھٹو کا خون ''خونِ خاکِ نشیناں نہیں تھا'' لیکن اسے ''رزق خاک'' بننے دیا گیا۔ 27 دسمبر 2007ء کو محترمہ نے جس دھج سے یقینی موت کا سامنا کیا، اسے دیکھتے ہوئے ان کی ''مفاہمت'' پالیسی پر بزدلی کی تہمت نہیں لگائی جا سکتی۔ پاکستان کے مخصوص حالات میں ''مجبوری'' کے راستے پر ایک لمبے سفر کا آغاز کہا جا سکتا ہے جس میں ''مختاری'' کی منزل بہت دور تھی۔ بنگلہ دیش میں فوجی افسروں نے شیخ مجیب الرحمٰن کے گھر میں گھس کر انہیں پورے خاندان سمیت قتل کر دیا تھا۔ حسینہ واجد ملک سے باہر تھیں، اس لئے خوش قسمتی سے بچ گئیں۔ وہ سیاست اور حکومت میں آئیں۔ خطرات بھی سامنے تھے لیکن وہ آج بھی اپنے خاندان کے فوجی قاتلوں کا تعاقب جاری رکھے ہوئے ہیں۔

اس کے برعکس مفاہمت کی جس پالیسی کی بنیاد 1988ء میں رکھی گئی تھی اس نے پیپلز پارٹی کو مجموعی طور پر ایک خوفزدہ سیاسی وجود بنا کر رکھ چھوڑا ہے، خوف اس کی نفسیات کا مستقل حصہ بن چکا ہے۔ اس پارٹی کی بھٹو قیادت اور عام کارکن جمہوریت کی جنگوں میں پھانسیاں، جیلیں اور جلاوطنیاں بھگت کر اور اسٹیبلشمنٹ کی دھاندلی کے باوجود فیصلہ کن طاقت بن کر اسمبلیوں میں پہنچتے ہیں۔ لیکن انہیں اسٹیبلشمنٹ کی شرطوں پر اقتدار قبول کرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ بھٹو کے نام پر الیکشن جیتنے والے انہیں ادھورا اقتدار لینے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ دوسری صورت میں وہی ہوتا ہے جو 2002ء کے الیکشن کے بعد ہوا۔ جنرل مشرف نے پیپلز پارٹی کے مطلوبہ ارکان توڑ کر جمالی حکومت بنا لی تھی۔ موجودہ حکومت اس لئے قائم ہے کہ ہر قسم کی گولہ باری کے باوجود صدارتی قلعہ ٹوٹا نہ قلعہ دار نے حکومتی اتحاد ٹوٹنے دیا۔

12 اکتوبر 1999ء کو اور اس کے بعد میاں نواز شریف کو جس ظلم اور اذیت سے گزرنا پڑا اس کی ہولنا کی 4 جولائی 1977ء سے 4 اپریل 1979ء تک کی اس واردات سے صرف اتنی ہی کم تھی کہ میاں صاحب نے پھانسی گھاٹ نہیں دیکھا اور نہ ہی ان چند لمحوں کی اذیت اور تڑپ سے گزرے جو پھانسی کے رسے کی چبھن اور پھر تختہ کھینچنے کے بعد محسوس ہوتی ہے۔ وہ معاہدے کے تحت یا معافی نامہ لکھ کر جلا وطن ہوئے یہ ایک بے معنی بحث ہے۔ میں اس معاملے کی تشریح یوں کرتا ہوں کہ انہوں نے جنرل پرویز مشرف سے خود حساب برابر کرنے کیلئے مہلت اور موقع حاصل کیا۔ سیاست انہوں نے جدہ ائرپورٹ پر اترتے ہی شروع کر دی تھی۔ انہوں نے سعودی حکمرانوں سے مشرف حکومت کے احتجاج اور شکایات کے باوجود ایک یا دوسرے طریقے سے میڈیا میں اپنے آپ کو زندہ رکھا پھر لندن جا کر کھل کر جلاوطنی کے معاہدے یا معافی نامے کے پرزے اڑائے اور وہاں اے پی سی بلا لی۔ واپسی کی ایک کوشش میں ناکام ہو کر انہیں دوبارہ جدہ جانا پڑا لیکن جب بینظیر صاحبہ مشرف کی مرضی کے خلاف واپس آ گئیں تو سعودی حکمرانوں کا دباؤ ڈلوا کر نواز شریف نے بھی واپسی کا راستہ نکال لیا۔ الیکشن کے لئے انہیں اور میاں شہباز شریف کو نااہل قرار دیا گیا لیکن ان دونوں بھائیوں نے

محترمہ کی شہادت کے باوجود اور خطرات کی پروا کئے بغیر ان تھک اور موثر انتخابی مہم چلائی۔ پنجاب اسمبلی میں اکثریت لے گئے اور دوسری بڑی پارٹی بن کر قومی اسمبلی میں پہنچے۔ اسٹیبلشمنٹ کی خواہشات کے برعکس ان کا واحد ٹارگٹ پرویز مشرف تھے۔ 3 نومبر کی عدلیہ کی بحالی کا مقصد اسی ٹارگٹ کو ہٹ کرنا تھا- یہی شکار مارنے کیلئے انہوں نے آل پاور فل وزیراعظم بننے کے سلسلے میں یوسف رضا گیلانی کی خواہش کو ممکن بنانے کیلئے قومی اسمبلی میں اپنے ووٹوں کو ان کی جھولی میں ڈالا اور آخر میں یہ دیکھ کر بہت مایوس ہوئے کہ یہ ''کھوبہ'' گیلانی صاحب کے بس کا روگ نہیں- 4 اپریل 1979ء والوں کے برعکس 12 اکتوبر 1999ء نے نواز شریف کو اسٹیبلشمنٹ کے خوف میں مبتلا کرنے کے بجائے اس کے خلاف تخت یا تختہ کی لڑائی لڑنے کا حوصلہ دیا ہے۔ انہیں حکومت لینے سے زیادہ بدلہ لینے میں دلچسپی ہے وہ پرویز مشرف کو اسی طرح خوار کرنا چاہتے ہیں جس طرح انہیں کیا گیا تھا۔ پیپلز پارٹی کی قیادت اور میاں نواز شریف میں یہی وہ فرق ہے جسے میاں صاحب کی طاقت وری اور پیپلز پارٹی کے حکمرانوں کی کمزوری قرار دیا جاتا ہے۔

■ ■ ■

28 اگست 2009ء

میرے دو مرحوم صحافی دوست ضیاء الاسلام انصاری اور مقبول شریف جنرل ضیاء الحق کے بہت مداح تھے۔ پیپلز پارٹی کے دور میں مقبول شریف صاحب کے ساتھ روزنامہ پاکستان ٹائمز میں کچھ زیادتیاں ہوئیں اس لئے وہ ذوالفقار علی بھٹو کے جانی دشمن تھے۔ امریکہ کے صدارتی انتخابات میں جمی کارٹر کامیاب ہوئے تو مقبول شریف کا پہلا تبصرہ یہ تھا کہ ''شکر ہے اب بھٹو سے جان چھوٹ جائے گی''۔ ممکن ہے یہ جملہ ان کی خواہش پر مبنی ہو لیکن جنرل ضیاء الحق نے ان کی یہ تمنا پوری کر دی۔ ضیاء الحق کی موت کے بعد میرے ان دونوں دوستوں کو یقین تھا کہ جنرل اسلم بیگ مارشل لاء

لگائیں گے اور کسی بھی صورت میں انتخابات کروا کے پیپلز پارٹی کو واپس آنے کا موقع نہیں دینگے۔ صدر غلام اسحاق خان اور جنرل اسلم بیگ کی حکمت عملی مختلف تھی۔ انہیں یقین تھا کہ وہ انتخابات سے ایسے مثبت نتائج برآمد کر سکتے ہیں کہ پیپلز پارٹی کو ادھورا سا اقتدار مل جائے اور پھر اسے گندا کر کے ہمیشہ کیلئے سیاست سے فارغ کر دیا جائے۔ پیپلز پارٹی کو اپنے منصوبے کے مطابق محدود کرنے کیلئے آرمی چیف جنرل اسلم بیگ نے نہ صرف آئی جے آئی بنوائی بلکہ خود کروڑوں روپے تقسیم کیے اور رگنگ بھی کروائی۔ رگنگ اتنی ماہرانہ اور سیلیکٹو تھی کہ سارے معاملے سے باخبر ہونے کے باوجود محترمہ بینظیر نے نہ صرف نتائج تسلیم کیے بلکہ وزارت عظمٰی حاصل کرنے کیلئے انتہائی گھاٹے کا ''سودا'' بھی کر لیا۔ خارجہ امور جیسی اہم وزارت صاحبزادہ یعقوب کو دے دی۔ آئندہ صدارت کیلئے غلام اسحاق خان کو اپنا امیدوار تسلیم کر لیا جو بھٹو صاحب کے قتل کے شریک ملزم تھے۔ میں نے اپنی صحافتی زندگی میں بہت ہی دردناک تصویریں دیکھیں اور شائع کی ہیں۔ لیکن اس ایک تصویر کی اذیت ابھی تک میرے دل کے کسی کونے میں پھنسی ہوئی ہے جس میں بھٹو کی بیٹی مسکراتے ہوئے اپنے بے مثال باپ کے قتل کے شریک مجرم کے بیلٹ بکس میں اپنا ووٹ ڈال رہی تھیں۔ پنجاب نواز شریف کے سپرد ہو چکا تھا۔ اوپر 58 ٹو بی سے مسلح غلام اسحاق خان بیٹھا تھا اور فوج کا سربراہ اسلم بیگ تھا جن کی نگرانی میں انتخابات میں دھاندلی ہوئی تھی اور مثبت نتائج نکالے گئے تھے۔ اس کے باوجود محترمہ نے حکومت قبول کر لی۔

ممکن ہے محترمہ کا خیال ہو کہ وہ اس کمپرومائز کے ذریعے ماضی کی دشمنیوں پر مٹی ڈالنے میں کامیاب ہو جائیں گی اور ایک نئے دور کا آغاز ہو سکے گا۔ پیپلز پارٹی کو یہ اندیشہ بھی تھا کہ اس نے اقتدار لینے سے انکار کیا تو اس کے ارکان قومی اسمبلی ٹوٹ جائیں گے۔ بھٹو کا ووٹ بنک جو 1970ء سے 1988ء تک قائم رہا اور 1988ء میں بھی اتنا وسیع تھا کہ اسٹیبلشمنٹ رگنگ نہ کراتی تو پیپلز پارٹی کلین سویپ کر گئی ہوتی۔ سوال یہ ہے کہ پیپلز پارٹی کے ٹکٹ ایسے لوگوں کو کیوں دیئے جاتے ہیں جو اقتدار میں ہوں تو پارٹی کی بدنامیاں سمیٹتے ہیں اور کارکنوں کو

نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اپوزیشن کا وقت آئے تو خود پیچھے رہ کر کارکنوں کو آگے کر دیتے ہیں۔ محترمہ اپنے ٹکٹ پر منتخب ہونے والوں کو اتنا کمزور یا ناقابل اعتبار کیوں سمجھتی تھیں؟ میرا خیال ہے کہ 88ء سے ملتی جلتی صورتحال 12 اکتوبر 1999ء جیسے سانحے سے گزر کر سیاست میں واپس آنے والے نواز شریف کے سامنے آئی ہوتی تو وہ اپوزیشن میں بیٹھ کر اسٹیبلشمنٹ کے خلاف فیصلہ کن جنگ کرنے کو ترجیح دیتے۔

ادھورا اقتدار لینے کی وجہ سے پیپلز پارٹی ہر دور اقتدار میں اپنے ان کارکنوں کی اکثریت کیلئے بھی کچھ نہیں کر سکی جو گیارہ سالہ جدوجہد میں تباہ و برباد ہو گئے تھے۔ جو ملک کے اندر اذیت ناک زندگیاں بسر کر رہے تھے یا عزت کی زندگیاں چھوڑ کر جلاوطنی میں ٹیکسی ڈرائیونگ یا سیلز مینی اور مینوئل لیبر کر کے اپنے خاندان پال رہے تھے۔ 1977ء کے ''غدر'' میں لاتعداد خاندان اجڑے۔ خاصی بڑی تعداد میں مختلف ملکوں میں پناہ گزین ہوئے اور ان کی نسلوں کا وطن کی سرزمین کی خوشبو اور زبان سے ناطہ ٹوٹ گیا۔

خیر بات 1988ء کی ہو رہی تھی۔ محترمہ بینظیر نے ایک ایسا اقتدار قبول کیا جو بدنیتی پر مبنی ایک منصوبے کا حصہ تھا۔ بینظیر حکومت کو بدنام کیا گیا اور پھر برطرف بھی کر دیا گیا۔ 1993ء میں دوسرا اقتدار انہیں اس لئے دیا گیا کہ میاں نواز شریف نے اسٹیبلشمنٹ کی ''غلامی'' قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس بار پیپلز پارٹی پہلے سے زیادہ اکثریت کے ساتھ جیتی تھی لیکن پنجاب کا اقتدار 18 سیٹوں والے میاں منظور وٹو نے ہتھیا لیا۔ صدارتی انتخابات میں فاروق لغاری کو زیادہ سے زیادہ ووٹ ڈلوانے میں آصف علی زرداری سب سے زیادہ سرگرم تھے۔ انہیں جتوا کر بہت خوشیاں منائی گئیں۔ اس وقت کہا گیا تھا کہ سازشوں کا اصل مرکز ایوان صدر بھی پیپلز پارٹی کے قبضے میں آ گیا ہے۔ فاروق لغاری بھٹو صاحب کے زمانے سے پیپلز پارٹی کے ساتھ تھے۔ جیلوں میں بھی رہے۔ صدارت کیلئے ان کا انتخاب بھی بظاہر پیپلز پارٹی نے خود کیا تھا۔ لیکن محترمہ بینظیر ''معصومیت'' میں اس حقیقت کو نظر انداز کر گئی تھیں کہ صدر کا اصل انتخاب اسٹیبلشمنٹ خود کرتی ہے اور پھر اسے اتنی خوبصورتی سے قابل قبول

بناتی ہے کہ پارٹی قیادت کو شبہ بھی نہیں ہونے دیتی کہ وہ اپنا کھیل کھیل گئی ہے۔ ایوان صدر کے جاہ وجلال میں پہلے تو لغاری صاحب کو پارٹی کے بجائے ذاتی مستقبل کی فکر لگی اور انہوں نے نجی طور پر ایک سروے کرایا جس میں یہ سوال پوچھا گیا تھا کہ کیا ان جیسے نابغہ روزگار کا صرف 5 سالہ صدارت کے بعد فارغ بیٹھ جانا ملک کیلئے نقصان دہ نہیں ہوگا؟ پھر وہ اپنی ''قائد'' کو ''ماتحت'' سمجھ کر غلام اسحاق بن گئے۔ محترمہ بینظیر کا یہ فیصلہ بنیادی طور پر ہی غلط تھا۔ 8ویں ترمیم کے تحت اختیارات دوحصوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ایک ایسے شخص کو صدر بنا دینا سراسر خودکشی تھی جس کی عمر ریٹائرمنٹ والی نہیں تھی اور جس کے سیاسی عزائم بھی جوان تھے۔ پھر اسٹیبلشمنٹ نے دوبارہ اپنا پرانا کھیل کھیلا۔ ''بھائی فاروق'' پر سال ہا سال کی وابستگی اور نیازمندی کے بعد آخری چند ماہ میں یہ انکشاف ہوا کہ پیپلز پارٹی کی حکومت کرپشن کر رہی ہے۔ محترمہ بینظیر کی حکومت برطرف کرنے سے پہلے مرتضٰی بھٹو کو کراچی میں قتل کرایا جا چکا تھا۔ حکمت عملی یہ تھی کہ مرتضٰی بھٹو کو راستے سے ہٹا کر بینظیر صاحبہ کو بدنامیوں اور مقدمات کے نیچے دفن کر دیا جائے تاکہ پیپلز پارٹی بھٹو کی ہر علامت سے محروم ہو کر ہمیشہ کیلئے ختم ہو جائے۔ انتخابات میں پیپلز پارٹی کو اس طرح ہروایا گیا کہ وہ مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں میں تانگہ پارٹی بن کر رہ گئی۔ خیال تھا کہ اسٹیبلشمنٹ کا ایک بہت پرانا خواب پہلی مرتبہ تعبیر سے ہمکنار ہو چکا ہے۔ پیپلز پارٹی نے پہلے دور حکومت میں دفاعی پالیسی اختیار کر کے اپنا امیج خراب کر لیا تھا جو بھٹو صاحب کا اصل ورثہ تھا۔ پیپلز پارٹی کے پاس دو ہی اثاثے تھے۔ اسٹیبلشمنٹ کی بالادستی کو چیلنج کرنا اور پسے ہوئے طبقوں کا وہ ووٹ بنک برقرار رکھنا جو اب بھی ''جئے بھٹو'' کے نعرے میں اپنی نجات تلاش کرتا ہے۔ اقتدار کے پہلے دونوں ادوار میں پیپلز پارٹی نے اپنے ان دونوں اثاثوں کو حکومت کرنے کے شوق کی نذر کئے رکھا۔ پھر اقتدار بھی گیا اور بھٹو صاحب کے نام سے منسوب وہ طاقت بھی کم ہو گئی جو اب بھی ان کی قبر سے طلوع ہوتی ہے اور ہر الیکشن کے ''کھوبے'' میں پیپلز پارٹی کو سہارا دیکر دوبارہ پاؤں پر کھڑا کر دیتی ہے۔ بھٹو کی پیپلز پارٹی کے چار نعروں میں ایک نعرہ یہ تھا۔ ''جمہوریت ہماری سیاست ہے''۔ 1988ء کے

دوران اس نعرے میں ترمیم کر کے جو نعرہ پیپلز پارٹی کے منشور کا حصہ بنا وہ یہ ہے۔ ''حکومت ہماری سیاست ہے''۔

■ ■ ■

29 اگست 2009ء جنرل اسلم بیگ (اب ریٹائرڈ) نے پیپلز پارٹی کو آئی جے آئی سے ہروانے کیلئے جو رقم تقسیم کی تھی اس میں سے 35 لاکھ میاں نواز شریف کو بھی ملا۔ یقیناً انہوں نے لیا ہی ہوگا اور خرچ بھی کیا ہوگا۔ ورنہ سپریم کورٹ آئی ایس آئی کیس کا ٹرائل کروانے میں ضرور دلچسپی لیتی - کوئی شبہ نہیں کہ اسے ان کے سیاسی کیریئر پر ایک داغ کہا جا سکتا ہے۔ شریف خاندان کے پاس پیسے کی کوئی کمی نہیں لیکن جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں میاں صاحب نے اپنی منزل کے حصول کیلئے بہت سے ناپسندیدہ کام بھی کئے ۔ وہ آگے بڑھنے کیلئے ایک ''گند'' کا حصہ بننے پر مجبور تھے۔ کچھ عرصہ پہلے میں نے ایک تصویر دیکھی ۔ جس میں نواز شریف صاحب ویٹر کی پگڑی سر پر رکھے ہوئے گورنر ہاؤس کی ایک دعوت میں بیٹھے تھے۔ بعد میں، عبدالقادر حسن کا ایک کالم پڑھا جس میں بتایا گیا تھا کہ میاں صاحب سے وزارت اعلیٰ کا حلف اٹھوانے کے بعد گورنر غلام جیلانی نے ازراہ تفنن ایک ویٹر کی پگڑی اتار کر ان کے سر پر رکھ دی تھی۔ شرم سے ان کا چہرہ زرد ہو گیا تھا لیکن وہ یہ تضحیک برداشت کر گئے۔ انہوں نے اپنے ابتدائی سیاسی سفر میں شاید کئی بار طاقتوروں کی طرف سے تضحیک سہی ہو اور مالی بے ضابطگیوں میں بھی ملوث ہوئے ہوں۔ بھٹو صاحب کے دور میں ان کی انڈسٹری قومیا لی گئی تھی اور شریف خاندان دیوالیہ ہو گیا تھا۔ جنرل ضیاء الحق کے مارشل لاء میں اس خاندان کو نئی زندگی ملی۔ نواز شریف صوبائی وزیر خزانہ بنے اور اپنے ٹارگٹ کی طرف راستہ بنانے کیلئے اسٹیبلشمنٹ کی نیاز مندی میں کوئی کمی نہیں چھوڑی۔

آگے چلنے سے پہلے میں ایک کہانی سنانا چاہتا ہوں جو برسوں پہلے میری نانی اماں نے

مجھے سنائی تھی۔ کہانی یہ تھی کہ سیالوں کے ایک خاندان کے مردوں نے اندھیری رات میں حملہ کر کے اپنے مخالف خاندان کے تمام مرد قتل کر دیئے تھے۔ ایک چھوٹا سا بچہ کسی طرح بچ نکلا، ایک طاقتور خاندان نے پناہ دے دی- اس خاندان نے قاتلوں کے خاندان سے رحم کی درخواست کی اور اپنا دباؤ بھی ڈالا- جواب میں قاتلوں نے یہ شرط رکھی کہ اس لڑکے کی بیوہ بھابیاں جوان بہنیں اور بھائیوں کی بیٹیاں ہمارے مردوں سے بیاہ دی جائیں۔ لڑکا کم عمر اور خوفزدہ ہونے کے باوجود یہ بات نہیں مان رہا تھا۔ اس کی عمر رسیدہ ماں نے کہا کہ یہ وقت ٹال جاؤ اور اپنے لئے اس وقت کا انتظار کرو جو کبھی نہ کبھی ضرور آئے گا۔ اس نے پوچھا ماں بدلہ کب تک لیا جا سکتا ہے۔ ماں نے جواب دیا تلوں کا گھڑا بھر لو، اپنے بازو پر تیل لگا کر اندر ڈالو اور باہر نکال کر تل گنو- جتنے تل تمہارے بازو پر چپکے ہوں گے بدلہ اتنے سال تک لیا جا سکتا ہے۔ کئی سال بعد یہ لڑکا جوان ہوا اور بہت سارے طاقتور نوجوان اپنے دوست بنا لئے- ایک رات اس نے اپنے خاندان کے قاتلوں کے گھر پر حملہ کیا اور اس کے سارے مرد مار ڈالے۔

میاں نواز شریف کا پہلا ٹارگٹ پیپلز پارٹی تھی۔ جس کو نشانہ بنانے کیلئے انہوں نے اسٹیبلشمنٹ کی تابعداری قبول کر لی، سویلینز کے ساتھ اسٹیبلشمنٹ کے تضحیک آمیز رویے برداشت کرتے رہے لیکن اس کا ردعمل ظاہر کرنے کے بجائے دل کے کسی کونے میں جمع کرتے گئے۔ اُنہوں نے 88ء کے الیکشن میں پیپلز پارٹی سے پنجاب چھیننے کیلئے اسٹیبلشمنٹ کی طاقت کو استعمال کیا۔ 90ء میں اسی عوام اور جمہوریت دشمن مافیا کی مدد سے وفاق میں پیپلز پارٹی کی حکومت برطرف کروائی اور مڈٹرم الیکشن میں وزیراعظم کا عہدہ حاصل کر لیا۔ پیپلز پارٹی سے محاذ آرائی کا تسلسل انہوں نے 1997ء کے انتخابات تک برقرار رکھا اس الیکشن کے دوران پیپلز پارٹی کا صدر اور چیف جسٹس ان کے ساتھ ملا ہوا تھا اور تاریخ میں پہلی مرتبہ پیپلز پارٹی کو بدترین شکست ہوئی۔ محترمہ بینظیر اور آصف زرداری پر کرپشن کے مقدمات بنانے کی ابتدا فاروق لغاری نے کی پھر سینیٹر سیف الرحمٰن جیسے جنونی کو ان پر چھوڑ دیا۔ اسٹیبلشمنٹ کے

بالا دست رویوں کے خلاف میاں نواز شریف کے اندر چھپی نفرت 1993ء میں ہی دل سے باہر آ گئی اور وہ صدر غلام اسحاق سے لڑ گئے تھے۔ جب وہ 1997ء میں دو تہائی اکثریت لیکر دوبارہ اقتدار میں آئے تو فوج سے لڑ گئے۔ یہی اینٹی اسٹیبلشمنٹ پالیسی ان کی موجودہ سیاست کی بنیاد ہے۔ پیپلز پارٹی کی دوسری حکومت برطرف ہونے کے بعد آصف زرداری جیل کے مستقل مکین بنے اور محترمہ لاہور، اسلام آباد اور کراچی کی عدالتوں کے درمیان شٹل بنی رہیں- ایک مقدمے میں سزا کا اعلان ہونے سے پہلے انہوں نے ملک چھوڑ دیا۔ میاں نواز شریف کو حکومت سے ہٹانے، قید کرنے اور سعودی عرب بھجوانے کے بعد پرویز مشرف نے محترمہ اور زرداری کے خلاف کرپشن کے مقدمات کو اپنی سیاست کا حصہ بنالیا- بار بار یہ فیصلہ بھی سناتے رہے کہ میں بینظیر اور نواز شریف دونوں کو وطن واپس نہیں آنے دونگا۔ ساتھ ساتھ الزامات کی بوچھاڑ اور نئی سے نئی بدنامیوں کا سلسلہ بھی جاری رکھا لیکن سیاسی پارٹی کے طور پر پیپلز پارٹی کا کچھ نہیں بگڑا۔ وہ 2002ء کے دھاندلی زدہ الیکشن میں بھی اتنی تعداد میں سیٹیں جیت کر قومی اسمبلی میں پہنچی کہ پرویز مشرف مخدوم امین فہیم کو وزارت عظمٰی دینے کیلئے بے چین تھے۔ محترمہ نے اس پیشکش کے ساتھ اپنی واپسی کی شرط رکھی۔ مشرف نہیں مانے۔ مخدوم امین فہیم نے غدار بن کر وزیراعظم بننے سے انکار کر دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ لالچ اور دباؤ کے ذریعے پیپلز پارٹی کے منتخب ارکان اسمبلی توڑے گئے اور مشرف صاحب نے ایک ووٹ کی اکثریت سے جمالی حکومت بنالی۔ ذوالفقار علی بھٹو محض ایک سیاسی لیڈر ہی نہیں پسے ہوئے عوام کے روحانی پیشوا بھی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے قتل کے بعد یہ جماعت ایک سیاسی وجود سے بلند ہو کر عقیدہ بن گئی تھی اور آج بھی اپنی یہ حیثیت برقرار رکھے ہوئے ہے۔ بھٹو صاحب کا ووٹ بنک محترمہ بینظیر کو منتقل ہوا اور پھر آصف زرداری کی میراث بن گیا- میرا خیال ہے کہ ہمارے ملک کا بھٹو دشمن میڈیا جتنا بھی زور لگا لے جب بھی ووٹ کا وقت آئے گا پیپلز پارٹی نامی سیاسی عقیدہ ہر قسم کے گرافوں اور سرویز کو غلط ثابت کر دے گا-

پرویز مشرف محترمہ بینظیر اور میاں نواز شریف کو ملک سے باہر رکھ کر دھاندلی سے

الیکشن جیتنا چاہتے تھے۔محترمہ نے امریکہ برطانیہ اور عرب امارات سے دباؤ ڈلوایا۔ وہ واپس آ کر جیل میں بیٹھنے کے بجائے آزاد رہ کر انتخابی مہم چلانا چاہتی تھیں۔ این آر او کا تحفظ لیکر وہ کراچی لوٹیں جہاں لاکھوں کا ہجوم ائرپورٹ سے مزار قائداعظم تک ان کے استقبال کیلئے جمع تھا۔خودکش دھماکوں میں سینکڑوں جانیں چلی گئیں لیکن اس تاریخی ہجوم نے این آر او پر پہلی مہر تصدیق ثبت کر دی تھی۔ کراچی کے خودکش دھماکے میں بال بال بچنے کے باوجود محترمہ نے انتخابی دورہ جاری رکھا۔ حملے کی پیشگی اطلاع کے باوجود وہ لیاقت باغ راولپنڈی پہنچیں جہاں انہیں بے دردی سے قتل کر دیا گیا۔ ملک آگ میں جل رہا تھا لیکن آصف زرداری نے پارٹی اور عوام کی کمان سنبھال کر ''پاکستان کھپے'' کا نعرہ لگایا اور ایک بار پھر ثابت کیا کہ ذوالفقار علی بھٹو اپنے پختہ ''عقیدے'' سمیت زندہ ہے اور اب بھی اس کا حکم چلتا ہے۔محترمہ کے قتل کے بعد زرداری صاحب انتخابی مہم پر نکلنے کے بجائے تعزیت وصول کرنے کے لئے گڑھی خدا بخش میں بیٹھ گئے تھے۔ کچھ عرصہ پہلے میں نے زرداری صاحب سے اس رویے کی وجہ پوچھی تو انہوں نے بتایا کہ میری پارٹی اور اس کے لیڈروں کی یہ حالت تھی کہ فیصل آباد کے رانا آفتاب کے سوا کوئی میرا جلسہ کرانے کیلئے تیار نہیں ہوا۔ کوئی کہتا تھا کہ دھماکے کے خوف سے لوگ نہیں آئیں گے۔ کسی کو شبہ تھا کہ لوگ آ گئے تو بم پھٹ جائے گا۔ ان حالات کے باوجود بھٹو اور بینظیر کے سیاسی وارث آصف علی زرداری کو اتنی نشستیں مل گئیں کہ وہ مرکز میں سب سے بڑی، سندھ میں اکثریتی اور پنجاب میں دوسری بڑی پارٹی بن کر اسمبلیوں میں آئی۔ بات کا بڑا ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے کہ سیاستدانوں کا احتساب انتخابات میں ہوتا ہے اور ان کے گناہ و ثواب کا فیصلہ عوام کے ووٹ کرتے ہیں۔ این آر او کو اخلاق اور قانون کے منافی قرار دینے والوں کے پاس اس بات کا کیا جواب ہے کہ ایک گھناؤنی میڈیا مہم کے باوجود پیپلز پارٹی عوام کے ووٹوں سے جیت کر اقتدار میں آئی، عوام نے اس کے این آر او کو بھی ووٹ دے دیا۔ یہ قانون کے آنے کے بعد مسلم لیگ (ق) اور پیپلز پارٹی کی مخالف تانگہ پارٹیوں کے لیڈر کپڑے اور گلے پھاڑ پھاڑ کر گلی گلی قصبے قصبے اور شہر شہر بین کرتے رہے لیکن پیپلز پارٹی کا ووٹ

بینک ٹس سے مس نہیں ہوا۔ این آر او نہ آتا تو شاید محترمہ بھی واپس نہ آتیں۔ اس طرح وہ قتل ہونے سے بھی بچ جاتیں۔ اسی طرح نواز شریف بھی نہ آ پاتے اور پرویز مشرف کی مسلم لیگ (ق) الیکشن جیت کر اپنا دوسرا دور حکومت شروع کر چکی ہوتی۔

نوٹ:۔ میں دانستہ طور پر بھٹو صاحب اور محترمہ کے ناموں کے ساتھ "شہید" نہیں لکھتا۔ یہ لفظ ہتھیار بند جنگوں میں شہید ہونے والوں کی حد تک موزوں ہے لیکن نہتوں اور مظلوموں مقتولوں کے ناموں کے سامنے یہ لفظ لکھتے ہوئے مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کسی سفاکانہ خون ناحق پر سبز غلاف چڑھا کر قاتل کے مجرمانہ فعل کی پردہ پوشی کی جا رہی ہو۔ اسی طرح کی ایک اور بات بھی بتاتا چلوں۔ ڈھاکہ پر بھارتی فوج کے قبضے اور پاکستانی فوج کے ہتھیار ڈالنے کے بعد جب میں نے اپنے اخبار (اس وقت مساوات) کی یہ سرخی میں لفظ کہ "سقوط ڈھاکہ" پڑھا تو میں نے اپنے نیوز ایڈیٹر کو بلا کر پوچھا تھا "یہ بتاؤ کہ یہ 'سقوط' کیا ہوتا ہے" اس نے وضاحت کرنا چاہی تو میں نے اُسے کہا کہ عام پڑھے لکھے لوگوں کو ایسے لفظوں سے گمراہ کرنے کی کوشش کیوں کرتے ہو۔ شکست کو سیدھی طرح شکست کیوں نہیں لکھتے۔

■ ■ ■

یکم ستمبر 2009ء

پچھلے کچھ دنوں سے ایک دلچسپ تماشا جاری ہے۔ آغاز اس طرح ہوا کہ بریگیڈئر (ر) امتیاز، اچانک اپنی کچھار سے نکلے اور چند ہوائی فائر کر دیئے۔ پھر ماضی کی سازشوں کے محرک، معمار اور شکاری اپنا اپنا اسلحہ لیکر چھتوں پر چڑھے اور ہر طرف اندھا دھند گولیاں چلنے لگیں۔ متحدہ قومی موومنٹ، میاں نواز شریف کے ترجمانوں، لیفٹیننٹ جنرل حمید گل اور ریٹائرڈ جنرل اسلم بیگ سمیت ماضی کے مختلف کردار اپنے اپنے سچ بیان کرنے لگے۔ اس بحث میں 1988ء اور 1990ء کے انتخابی نتائج پر

واضح سوالیہ نشان لگ گئے ہیں۔ غلام اسحاق مرحوم کی اصول پرستی بے نقاب ہوئی ہے اور جنرل (ر) اسلم بیگ کا تمغہ جمہوریت مذاق بن گیا ہے۔ ایک مجموعی تاثر یہ بنا ہے کہ جنرل ہوں یا سیاستدان، ملک اور عوام کا بھلا سوچنے کے بجائے محض سیاسی تماشے لگاتے رہے، جن میں ووٹ کا تقدس پامال ہوا۔ ہزاروں بے گناہ مارے گئے۔ ادارے تباہ ہو گئے اور آج بھی ملک کے مستقبل پر دھند اتنی گہری اور راستے میں گڑھے اتنے خطرناک ہیں کہ خیر کی توقع نہیں رکھنی چاہیے۔ اس کھیل میں بریگیڈئر (ر) امتیاز یقیناً اکیلے نہیں ہیں۔ کوئی نہ کوئی ضرور ان کے پیچھے ہے۔ ان کا ٹارگٹ کیا ہے، کوئی نہیں جانتا۔ مسلم لیگ (ن) کے کچھ لیڈروں اور زرداری صاحب کے مستقل مہربانوں کا خیال ہے کہ اس کھیل کے پیچھے ایوان صدر کا کوئی خصوصی سیل ہے۔ کچھ لوگ واشنگٹن میں پاکستان کے سفیر حسین حقانی کو یہ ''کریڈٹ'' دیتے ہیں۔ بریگیڈئر (ر) امتیاز کو حسین حقانی کے ساتھ جوڑنے کی وجہ سے یہ بیان کی جاتی ہے کہ جنرل ضیاء الحق کی موت کے بعد محترمہ بینظیر بھٹو اور پیپلز پارٹی کے خلاف وہ گھناؤنی مہم اسی جوڑی کا کارنامہ تھا۔ جس میں کردار کشی کی تمام حدیں پار کی گئی تھیں۔ حقانی صاحب کی شہرت سے متاثر ہو کر محترمہ بینظیر نے بھی انہیں اپنے پلے باندھ لیا تھا لیکن وہ ویسے ہی ایک ''عامل نجومی'' ثابت ہوئے جن کے اشتہار پڑھ کر ضعیف الاعتقاد لوگ انہیں نجات دہندہ سمجھ لیتے ہیں۔ لیکن جب مدد لینے کے لئے جاتے ہیں۔ وہ ''دھونی'' دے دے کر جن پر قابو کرتے کرتے ذہنی یا نفسیاتی مریض عورتوں خصوصاً نوجوان لڑکیوں کو جان سے مار دیتے ہیں اور سائلوں کا سوا ستیاناس کر دیتے ہیں۔ حقانی صاحب اپنی جناتی صلاحیتوں کے ماہر سیلز مین ہیں۔ اقتدار ملنے کے بعد زرداری صاحب نے انہیں امریکہ کو ''دھونی'' دینے پر مامور کر دیا تھا لیکن نتیجہ یہ نکلا ہے فرینڈز آف پاکستان جیسے سہانے خواب دکھا دکھا کر امریکہ ہم پر اتنا حاوی ہو گیا ہے کہ اس کے چھوٹے بڑے عہدیدار وقفے وقفے سے نئے نئے حکم سنانے اور حکومت کو یہ جتلانے آ جاتے ہیں کہ وہ ان کی وجہ سے قائم ہے۔

1986ء میں وطن واپسی سے لیکر 2007ء میں آخری وطن واپسی تک محترمہ بینظیر

نے بھٹو صاحب کے المناک قتل کے اس سانحے سے جنم لینے والی تباہی کو اپنی سیاسی جدوجہد کا محور بنانے کے بجائے امریکہ اور اسٹیبلشمنٹ کے ساتھ مفاہمت کی پالیسی اپنائی، بار بار دھوکے کھائے اور نئی سے نئی مصیبتوں کا سامنا کرتی رہیں۔ آخری واپسی بھی انہوں نے ''ڈیل'' کے ذریعے ممکن بنائی تھی۔ ریٹائرڈ جنرل اسلم بیگ کا کہنا ہے کہ وہ پاکستان آ کر مشرف اور امریکہ کے ساتھ طے شدہ معاہدے سے منحرف ہو گئی تھیں اس لئے انہیں راستے سے ہٹا دیا گیا۔ جلاوطنی کے دوران محترمہ نے میاں نواز شریف کے ساتھ دشمنی ختم کر لی تھی اور میثاق جمہوریت پر دستخط کئے تھے۔ یہ ایک اینٹی اسٹیبلشمنٹ معاہدہ تھا۔ جس پر عملدرآمد کا خواب دیکھا گیا۔ محترمہ اور میاں صاحب کی واپسی کی حکمت عملی ایک دوسرے سے مختلف تھی لیکن ظاہری طور پر نصب العین ایک تھا اور وہ یہ کہ ماورائے عوام سیاست نہیں کریں گے۔ کراچی کے استقبال نے غیر عوامی طاقتوں کو اتنا خوفزدہ کیا کہ وہ انہیں راستے سے ہٹانے پر تل گئیں۔ وہ قتل کی پہلی سازش سے بچ نکلیں۔ لیکن وہ خطرات سے اس حد تک آگاہ تھیں کہ واشنگٹن سے آخری روانگی سے پہلے ایک محفل میں یہاں تک کہہ دیا تھا کہ شاید یہ میرا آخری دورہ ہو، وہ گڑھی خدا بخش میں بھٹو صاحب کی قبر کے ساتھ اپنی آخری آرام گاہ کی جگہ کی نشاندہی کر کے موت کے سفر پر روانہ ہوئیں۔ لیاقت باغ کے جلسہ سے ایک رات پہلے انہیں ایک طاقتور حکومتی خیر خواہ نے سازش سے خبردار کر دیا تھا لیکن انہوں نے کوئی پروا نہیں کی اور قتل گاہ میں آ پہنچیں، اس طرح انہوں نے مفاہمت کی اس پالیسی کے داغ اپنے خون سے دھو دیئے۔ جو انہوں نے 1988ء میں غلام اسحاق سمیت اپنے باپ کے قتل کے شریک مجرموں کے سلسلے میں اپنائی تھی۔

ماورائے عوام طاقتوں کے ہاتھوں محترمہ بینظیر کے سفاکانہ قتل کے باوجود میاں نواز شریف اپنے اس عزم پر قائم رہے کہ جنرل پرویز مشرف سے ملک آئین اور اپنی ذات پر لگنے والے زخموں کا حساب ضرور لیں گے۔ آصف زرداری صاحب کا لائحہ عمل مختلف تھا۔ انہوں نے ''جمہوریت بہترین انتقام ہے'' کے نعرے کو اپنی سیاست کی بنیاد بنایا۔ ایم کیو ایم سے معافی تلافی کیلئے خود نائن زیرو گئے اور وہاں مخلوط حکومت بنا لی۔ بلوچستان میں پیپلز پارٹی کی

حکومت قائم کر لی اور سرحد حکومت میں اے این پی کے جونیئر پارٹنر بن گئے۔ وفاق میں اپنے نامزد وزیراعظم کو متفقہ طور پر منتخب کرایا۔ قومی اسمبلی میں سپیکر کا عہدہ لیا۔ خود دو تہائی سے زیادہ اکثریت کے ساتھ صدر منتخب ہوئے اور پھر فاروق اے نائیک کو چیئرمین سینٹ بنوا لیا۔ اس کھیل میں شاندار شاٹ کھیلے لیکن 3 نومبر کی عدلیہ کی بحالی کے تنازعے پر میاں نواز شریف کے ساتھ اعتماد کے رشتوں سے محروم ہو گئے۔ ججوں کی بحالی کے پہلے معاہدے کے ذریعے انہوں نے یوسف رضا گیلانی صاحب کو متفقہ وزیراعظم بنوایا اور دوسرے معاہدے کی مدد سے جنرل پرویز مشرف کا استعفٰی لیا لیکن جب صدارتی انتخاب میں دو تہائی سے زیادہ اکثریت لیکر خود ایوان صدر میں پہنچے تو وہ معزول ججوں کی بحالی کے وعدے کو عملی جامہ پہنانے سے انکار کر کے متنازعہ ہو گئے۔

انہوں نے اس سیاسی میچ کی پہلی اننگز میں میاں نواز شریف پر واضح برتری حاصل کر لی تھی۔ چیف جسٹس عبدالحمید ڈوگر بھی ان کا تھا۔ وزیراعظم بھی، سپیکر اور چیئرمین سینٹ بھی ''اپنے'' تھے۔ لیکن اس دوران ہر گیند کو آسان سمجھ کر وہ ایک غلط شاٹ بھی کھیل گئے جسے میاں نواز شریف نے کیچ کر لیا۔ انہوں نے 1993ء کا سبق یاد نہیں رکھا اور ایک بار پھر وفاق میں طاقت کے دو مراکز بنا دیئے۔ زرداری صاحب کے بعض قریبی حلقوں کا کہنا ہے کہ وہ چیف جسٹس سمیت 3 نومبر کی عدلیہ کو بحال کرنا چاہتے تھے لیکن ''خیر خواہوں'' کا مشورہ مان کر ارادہ بدل دیا۔ چودھری اعتزاز احسن نے انہیں ایک سنہری موقع فراہم کیا۔ ججوں کی رہائی کے بعد وہ جسٹس افتخار محمد چودھری کو محترمہ بینظیر کیلئے اظہار تعزیت کرنے کیلئے بلاول ہاؤس لے آئے تھے لیکن زرداری صاحب نوشتہ دیوار نہیں پڑھ سکے۔ دوسرے لفظوں میں انہیں پڑھنے ہی نہیں دیا گیا۔ میاں نواز شریف کا لانگ مارچ شروع ہونے کے بعد شاید انہیں اچانک ہی یہ پتہ چلا ہو کہ وہ ٹریپ ہو چکے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ رات گئے انہیں اپنے ہی ایک معتمد نے خبردار کیا تھا کہ ٹرپل ون بریگیڈ حرکت میں آنے والا ہے اور میاں نواز شریف کا جلوس اسلام آباد پہنچ گیا تو بہت خون خرابہ ہو گا۔ صورتحال کی سنگینی کا اندازہ کر کے انہیں اس فیصلے پر پہنچنا پڑا

کہ ٹرپل ون بریگیڈ ایک ہو یا دو تب بھی جمہوریت ہی بہترین انتقام ہے۔

اس بہترین انتقام کی اصل اینٹ پہلے ہی اپنی جگہ سے کھسک چکی تھی۔ 1993ء کے اقتدار میں پیپلز پارٹی نے اپنا صدر اور اپنا چیف جسٹس بنایا تھا۔ انہی دونوں نے مل کر اسے اقتدار سے ہٹایا اور بری طرح ہرا دیا لیکن نواز شریف صاحب نے اقتدار کی اس بنیادی حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا کہ اس بے رحم کھیل میں مروت یا وفا جیسے رشتے کچے دھاگے سے بھی زیادہ کمزور ہوتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ میاں صاحب کا ہنستا مسکراتا وفد جب لغاری صاحب کو چوٹی میں ملا اور یہ خوشخبری سنائی کہ انہیں 58 (ٹو) بی سمیت تمام صدارتی اختیارات سے محروم کیا جارہا ہے۔ وہ سناٹے میں آ گئے تھے۔ نواز اپنے پہلے دور میں طاقت کے دومراکز کا نتیجہ بھگت چکے تھے۔ اس لئے صدر کے اختیارات ختم کر دیئے۔ لغاری صاحب خالی ہاتھ تھے۔ انہوں نے چیف جسٹس سجاد علی شاہ کی طاقت کو حرکت میں لا کر لڑائی لڑی لیکن ہار گئے۔ چیف جسٹس کو بھی ان کے ساتھ جانا پڑا۔ اس کامیابی کے بعد نواز شریف پوری تیاری کئے بغیر طاقت کے تیسرے مرکز سے الجھ پڑے لیکن دوسری طرف جنرل پرویز مشرف نے جی ایچ کیو کو پہلے ہی الرٹ کر رکھا تھا اس لئے انہیں شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ میاں نواز شریف نے اپنے دونوں اقتدار لڑ کر ہارے جبکہ پیپلز پارٹی نے ایک اقتدار کھلے دشمنوں سے مفاہمت کر کے گنوایا اور دوسرا اس غلط فہمی میں گنوا دیا کہ اقتدار میں احسان نامی کسی چیز کی کوئی وقعت ہوتی ہے۔ صدر بننے کے بعد فاروق لغاری صاحب اچانک اس طرح بدلے کہ خود بینظیر صاحبہ ششدر رہ گئیں پھر انہوں نے پیپلز پارٹی کو اتنی مہلک ضرب لگائی کہ محترمہ بینظیر، آصف زرداری اور پیپلز پارٹی کو دس سال کیلئے دربدر ہونا پڑا۔ تیسرے اقتدار کیلئے محترمہ بینظیر نے اپنی زندگی داؤ پر لگائی۔ لیکن ایک بار پھر اقتدار کے دو مراکز بن چکے ہیں۔ پارٹی (ایوان صدر سے منسلک) اور حکومت دو الگ الگ وجود دکھائی دیتے ہیں۔ اگر یہ کوئی طے شدہ ''فارمولا'' نہیں تو کیا فیصلہ کن سیاسی پتے ایک بار پھر میاں نواز شریف کے ہاتھ میں ہیں۔

■ ■ ■

2 ستمبر 2009ء

میں بھٹو صاحب کی المناک موت کے دنوں میں خود جیل میں تھا۔ وہ خونیں رات آج بھی میرے دل میں درد کا تیر بن کر پیوست ہے۔ میں ان کے سیاسی وارث صدر آصف علی زرداری کا اس لئے دفاع کرتا ہوں کہ انہیں ویسی ہی سیاسی اور جانی دشمنی اور کردار کشی کا سامنا ہے جو پہلے بھٹو صاحب کے حصے میں آئی اور پھر محترمہ بینظیر کا مقدر بنی۔ ''بھٹوز کے بغیر پیپلز پارٹی'' کے نام پر ایک سیاسی جماعت وجود میں لانا بعض طاقتوں کا پرانا اور گھناؤنا ایجنڈا ہے۔ ان طاقتوں نے بھٹو صاحب کے بعد ان کے دو بیٹے قتل کرائے۔ آخری شکار ان کی وہ بیٹی ہوئی جس کا قصور صرف یہ تھا کہ وہ ہر قیمت پر اپنے باپ کی سیاسی وراثت کو زندہ رکھنا چاہتی تھی۔ اب زرداری صاحب اس لئے ٹارگٹ ہیں کہ انہیں ہٹائے بغیر گڑھی خدا بخش کی قبروں سے جڑی ہوئی پیپلز پارٹی کو برباد نہیں کیا جا سکتا۔ اس پارٹی کی تباہی اس لئے ضروری ہے کہ جب تک یہ قبریں سیاست سے غائب نہیں ہو جاتیں، بھٹوز کا خون ناحق انصاف کیلئے پکارتا اور اسٹیبلشمنٹ سے حساب مانگتا رہے گا۔

جنرل (ر) اسلم بیگ کہتے ہیں کہ محترمہ مشرف اور امریکہ کے ساتھ کسی معاہدے سے منحرف ہو گئی تھیں۔ بیگ صاحب 88ء اور 90ء کے انتخابات میں پیپلز پارٹی کا انتخابی مینڈیٹ بدلنے اور محدود کرنے پر مامور تھے۔ انہوں نے بینظیر صاحبہ سے ''بعد از مرگ انصاف'' کرتے ہوئے یہ بھی مانا ہے کہ وہ سکیورٹی رسک نہیں تھیں اور یہ کہ انہوں نے تو ممکنہ حملے کے جواب میں بھارت کی ایٹمی تنصیبات تباہ کرنے کا حکم دیا تھا۔ جب سے بھٹو کا ورثہ محترمہ بینظیر سے گزرتا ہوا آصف زرداری صاحب کو منتقل ہوا ہے، اُنہیں ''واحد برا آدمی'' ثابت کرنے کیلئے انتہائی گھناؤنا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ آئی ایس آئی کے ذریعے رقوم کی تقسیم کے سکینڈل پر تبصرہ کرتے ہوئے مسلم لیگ (ن) کے سیکرٹری اطلاعات احسن اقبال یہ کہتے ہیں کہ میاں نواز شریف کے خلاف اس طرح کے الزامات کو عوام انتخابات میں رد کر چکے ہیں۔ یہ اصول کسی ایک آدمی پر لاگو نہیں کیا جاتا تو وہ صرف آصف زرداری ہیں۔ پیپلز پارٹی ان کی قیادت میں الیکشن جیتی۔ وہ خود قومی اسمبلی، سینٹ اور چاروں صوبائی اسمبلیوں سے 481

ووٹ لیکر منتخب ہوئے۔ عام انتخابات اور صدارتی انتخابات کے دوران این آر او کی قوالی پورے زور وشور سے جاری تھی مگر عوام نے اسے حقارت سے رد کر دیا۔

نیا ایجنڈا یہ ہے کہ صدر اور وزیراعظم کے تعلقات میں کشیدگی اور تلخی بڑھائی جائے۔ یہی وجہ ہے معاملے کو مزید خراب کرنے کے خواہشمند بعض جیالوں کو اب یاد آیا ہے کہ جب بھٹو صاحب پھانسی چڑھ رہے تھے تو یوسف رضا گیلانی، جنرل ضیاء الحق کے اس کیمپ میں تھے جہاں جشن فتح برپا تھا۔ انہیں بھٹو صاحب کی کرسی پر بٹھا کر بھٹو صاحب کی روح پر ایک اور زخم لگایا گیا ہے۔ گیلانی صاحب کو محترمہ بینظیر نے اپنے دوسرے دور میں سپیکر بھی منتخب کرایا تھا۔ انہوں نے پارٹی لیڈر کی بعض ہدایات کو نظر انداز کیا تھا لیکن بعد میں پیپلز پارٹی کا ساتھ نہ چھوڑنے کی پاداش میں چار سال کی جیل بھی کاٹی۔ جو صرف ایک ''ہاں'' کے بدلے میں صرف ایک گھنٹے یا ایک دن میں تبدیل ہو سکتی تھی۔ پیپلز پارٹی کے اندر موجود ٹکراؤ کی وجہ اور یونٹی آف کمانڈ کے فقدان کا سبب یہ ہے کہ وزیراعظم اپنی پارٹی کی قیادت کے علاوہ پارلیمنٹ کو بھی جوابدہ ہیں اور انہیں کچھ فیصلوں کیلئے اس اپنی صوابدید کو بروئے کار لانا پڑتا ہے۔ گیلانی صاحب کو وزیراعظم بنانے کا فیصلہ آصف زرداری صاحب نے خود کیا یا ان سے کروایا گیا یہ اپنی جگہ ایک راز ہے۔ زرداری صاحب اس مرتبہ ایوان صدر میں بیٹھ کر اپنی حکومت کی حفاظت کرنا چاہتے تھے۔ ہمارے ملک کی صدارت ایک ایسا حساس عہدہ ہے جس کیلئے ووٹوں سے ماورا طاقتوں کی کلیرنس بھی ضروری ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ نیک چلنی کی ضمانت کے طور پر یوسف رضا گیلانی صاحب پر ہی اتفاق ہوا ہو۔ پیپلز پارٹی کے برعکس میاں نواز شریف نے تو یہ مثبت تجویز بھی نہیں مانی کہ وہ مشرف کی اقتدار سے محرومی اور جلاوطنی کو ہی کافی سزا سمجھ لیں۔ سوال یہ ہے کہ اقتدار کے ہر دور میں خوف اور مجبوریاں صرف پیپلز پارٹی پر ہی کیوں مسلط کی جاتی ہیں؟ اور وہ کس منطق کے تحت یہ مان لیتی ہے کہ اقتدار کے بپھرے ہوئے دریا کو پشت پر بندھے ہوئے ہاتھوں کے باوجود پار کر لے گی۔

اقتدار کے پہلے دو ادوار میں بھٹو صاحب کا خون معاف کیا گیا۔ اس مرتبہ محترمہ بینظیر

کے قتل کی واردات اپنے طور پر اتنی پراسرار ہے کہ اس کا اصل مرکز ڈھونڈا ہی نہیں جا سکتا۔

صدر آصف زرداری کو طعنہ دیا جاتا ہے کہ وہ محترمہ کے قاتلوں کو گرفتار نہیں کر سکے۔ یہ اسی طرح کا ایک گلہ ہے کہ انہوں نے جنرل پرویز مشرف کو آرٹیکل 6 کے تحت گرفتار نہیں کرایا۔ پچھلے دنوں راولپنڈی میں ملاقات کے دوران میاں نواز شریف نے بھی مشرف کے خلاف آرٹیکل 6 کے تحت کارروائی کا مطالبہ کیا تھا جس کا جواب زرداری صاحب نے ان الفاظ میں دیا کہ میں ایک کمزور سندھی ہوں۔ یہ کام آپ خود کر لیں۔ آپ ایک مقبول اور طاقتور لیڈر ہیں اس کے بعد صدر صاحب نے اپنا یہ تجزیہ بھی سنا دیا کہ اس ملک میں مقبول لیڈروں کو ''رہنے'' نہیں دیا جاتا۔ لگتا ہے کہ ایوان صدر کے قید خانے میں داخلے کی اجازت دینے سے پہلے انہیں ''جیل مینوئل'' کی کچھ شرطیں اچھی طرح پڑھا دی گئی تھیں، ان میں عوام کی روحوں کو زخمی کر دینے والا ایک شاندار گارڈ آف آنر، حکمرانوں جیسا پروٹوکول اور سکیورٹی کے علاوہ یہ شرط بھی شامل تھی کہ پرویز مشرف کو ملک کے اندر بے فکری سے دندنانے دیا جائے گا اور مناسب وقت پر پورے احترام سے ملک چھوڑنے کی اجازت ہو گی۔ مشرف آزاد عدلیہ کی بحالی کے بعد (جسے برطرف کر کے انہوں نے آرٹیکل 6 کے تحت غداری کا ارتکاب کیا تھا) دس دن سے زیادہ عرصہ پاکستان میں بیٹھے رہے تاکہ بعد میں کوئی یہ طعنہ نہ دے سکے کہ ڈر کر بھاگ نکلے تھے۔ پرویز مشرف کے لئے یہ سارا بندوبست استعفیٰ دلوانے والوں کے احکامات میں شامل تھا۔ سارے معاملات سے باخبر ہونے کے باوجود گارڈ آف آنر کو کالک بنا کر ایوان صدر پر مل دیا گیا اصولی طور پر تمام حکومتی اختیارات یوسف رضا گیلانی صاحب کے پاس ہیں تاہم وہ بھی وزیراعظم ہاؤس کے ''جیل مینوئل'' کی پابندی کرنے پر مجبور ہیں اور جس میں پرویز مشرف کے خلاف غداری کا مقدمہ درج کرانے کی اجازت نہیں۔

وزیراعظم صاحب طاقتور بھی ہیں اور خودمختار بھی۔ مسلم لیگ (ن) نے اپنی پارلیمانی طاقت کی حمایت کا یقین دلا کر انہیں پیپلز پارٹی کی مکمل محتاجی سے نجات دلائی لیکن جب نواز شریف کا اہم ترین مطالبہ پورا کرنے کا وقت آیا تو انہوں نے ایک ناممکن شرط لگا کر یہ بھی کہہ

دیا کہ ''میں مشرف کو معاف کر چکا ہوں''۔ نواز شریف کو یہ ''میں'' یقیناً اچھی نہیں لگی ہوگی۔ ادھر سعودی عرب میں مشرف کی مہمان نوازی سے بھی میاں صاحب کو کافی دھچکا لگا ہوگا جس سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آ گئی کہ مشرف کا ''کھوبہ'' محض قومی نہیں، بین الاقوامی بھی ہے اور بہت ہی گہرا بھی۔

■ ■ ■

4 ستمبر 2009ء

پاکستان کی نصف زندگی مارشل لاؤں کی نذر ہوئی۔ 1988ء سے 1999ء تک تین بار جمہوریت پر 58ٹو بی کی تلوار چلی جسے جنرل ضیاء الحق ایوان صدر میں سجا گئے تھے۔ خفیہ ایجنسیوں نے ووٹوں پر ڈاکے ڈلوائے۔ بھٹو صاحب کی سیاست نے ایوب خان کے مارشل لاء میں جنم لیا۔ وہ کابینہ سے نکل کر مقبول عوامی لیڈر بنے۔ ملک ٹوٹنے کے بعد حکومتی تسلسل برقرار رکھنے کیلئے انہیں خود مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اور صدر کا عہدہ قبول کرنا پڑا اور جمہوریت پر یہ پہلے دونوں ناجائز قبضے تباہی کی داستانوں سمیت ماضی میں دفن ہو گئے۔ بھٹو صاحب 1973ء کے آئین میں آرٹیکل 6 شامل کر کے اس خوش فہمی میں مبتلا ہو گئے تھے کہ آئندہ کوئی جنرل مارشل لاء لگانے کی جرات نہیں کرے گا۔ 4جولائی 1977ء کو جنرل ضیاء الحق نے فوج کشی کر کے اقتدار پر قبضہ کیا اور پھر 4اپریل 1979ء کو بھٹو صاحب کے خلاف ہائیکورٹ اور سپریم کورٹ سے فیصلے لیکر انہیں پھانسی دے دی۔

گیارہ سالہ ظلم وتشدد کے باوجود پیپلز پارٹی کا ووٹ بینک برقرار تھا، اس لئے 1988ء میں صدر غلام اسحاق اور آرمی چیف اسلم بیگ نے انتخابی نتائج میں اپنی مرضی کا ہیر پھیر کر کے محترمہ بینظیر کو اُدھورا سا اقتدار دے دیا۔ طے شدہ منصوبے کے تحت اُنہیں بدنام کر کے فارغ کیا گیا۔ بینظیر صاحبہ باپ کی پھانسی سمیت مصیبتوں اور دکھوں کا طویل سفر طے کر کے آئی

تھیں اس لئے یہ بھی برداشت کر لیتی تھیں کہ جنرل اسلم بیگ اُنہیں سیلیوٹ نہیں کرتے تو نہ کریں۔1990 میں نواز شریف کو لایا گیا۔ ان سے مکمل تابعداری کی توقع تھی لیکن وہ اپنے اختیارات اور منصب کے تقدس پر ڈٹ گئے۔ جب صدر نے انہیں برطرف کیا تو وہ سپریم کورٹ سے بحال ہو کر آ گئے۔ دو بڑے عہدوں میں ورکنگ ریلیشن شپ ناممکن ہو چکی تھی اس لئے یہ تنازعہ آرمی چیف عبدالوحید کاکڑ کی ثالثی بلکہ دباؤ سے اس طرح طے ہوا کہ غلام اسحاق اور نواز شریف دونوں کو استعفے دینے پڑے۔محترمہ بینظیر دوبارہ اقتدار میں آئیں اور ایک بار پھر برطرف ہوئیں۔ آخر میں نواز شریف دو تہائی اکثریت سے جیت کر آئے اور اس مضبوطی سے قدم جمالئے کہ کسی آئینی سازش کے ذریعے اُنہیں ہٹانا ناممکن تھا۔ وہ فوج کو ماتحت اور اپنے حکم کا پابند ادارہ سمجھتے تھے اس لئے جنرل پرویز مشرف اور اُن کی ٹیم نے انہیں اقتدار سے باہر نکال دیا۔

یہ واقعات میں پہلے بھی تفصیل کے ساتھ لکھ چکا ہوں۔خلاصہ دوبارہ بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ہمارے ملک میں اقتدار کا سب سے طاقتور ستون فوج ہے دوسرے لفظوں میں آرمی چیف ہوتا ہے۔پچھلے چاروں مارشل لاء اس فردِ واحد کے حکم سے لگے جو آرمی چیف کے عہدے پر فائز تھا اور جس کا فیصلہ حرفِ آخر سمجھ کر قبول کرنا پڑتا ہے۔ اس ڈسپلنڈ فورس میں جائز یا ناجائز کے سوال اس لئے نہیں اُٹھتے کہ حکم کی تعمیل میں ہی اس ادارے کی بقا مضمر ہے۔ یہ تربیت بھی ہے اور ایمان کا حصہ بھی۔فوج کا بنیادی فرض سرحدوں کا دفاع ہے۔ وہ داخلی خطرات میں بھی حکومت کی مدد کرنے کی پابند ہوتی ہے۔لیکن اسے ملک پر قبضے کا کوئی اختیار نہیں،فوج کے چار سربراہوں نے حکومتوں پر قبضہ کر کے خود کو بادشاہ قرار دیا۔ اپنے ہی حکم سے اپنی مدت ملازمت بڑھاتے گئے اور بہت سے حقدار اپنے ادارے کے سب سے بڑے عہدے پر فائز ہونے کے اس اعزاز سے محروم رہ گئے جو ہر لیفٹیننٹ جنرل کا خواب ہوتا ہے۔ ہر مارشل لاء فوج کے نام پر لگایا گیا اور ہر قابض فردِ واحد نے اپنے عہدے کو ذاتی ہوسِ اقتدار پورا کرنے کیلئے استعمال کیا۔ جنرل یحییٰ کو تو وقت ہی بہت تھوڑا ملا تھا لیکن جنرل ایوب خان،

جنرل ضیاالحق اور جنرل پرویز مشرف کا ساتھ دینے والے لیفٹیننٹ جنرل اپنی اپنی مدت ملازمت سے خاموشی سے ریٹائر ہو گئے۔ یہ تینوں خود کو نجات دہندہ قرار دیکر ملک پر مسلط رہے۔ کیا یہ وقت کا تقاضا نہیں کہ فوج کی اعلیٰ کمان میں اس معاملے پر تفصیلی بحث ہو اور وہ اس سوال کا جائزہ لے کہ سول حکمرانوں کی صوابدید سے آرمی چیف کے عہدے پر فائز ہونے والے طالع آزماؤں نے ملک یا فوج کے کس قانون کے تحت سول اقتدار پر قبضہ کیا؟ کیا وہ اپنے آئینی عہدے اور اختیارات سے تجاوز اور اپنے ادارے کی طاقت سے ناجائز فائدہ اٹھانے کے مرتکب نہیں ہوئے؟ کیا اپنے اپنے دور میں وہ خدا کے ''اوتار'' تھے یا بدی کے نمائندے، کیا موجودہ فوجی کمان کو ایوب، یحیٰی، ضیا اور مشرف کا اسی طرح کورٹ مارشل نہیں کرنا چاہیئے جو ناکام بغاوتوں میں ملوث فوجی افسروں کے ساتھ ہوتا ہے۔

سیاستدانوں کے گناہ اپنی جگہ، وہ اپوزیشن میں ہوں تو اگلے الیکشن کا انتظار کرنے کے بجائے فوج کو آوازیں دینے لگتے ہیں اور پھر میڈیا کا بھی کوئی نہ کوئی ایسا حصہ ان کے ساتھ شریک ہو جاتا ہے اور اسٹیبلشمنٹ کی طرح ذاتی نفرتوں کو بیلٹ کے خلاف بلٹ بنا لیتا ہے۔ مشرف صاحب کی رخصتی اور موجودہ سیٹ اپ کے قیام میں جنرل اشفاق پرویز کیانی اپنا حصہ نہ ڈالتے تو شاید یہ پیدا ہونے سے پہلے یا جنم لیتے ہی یا اس کے فوراً بعد مر چکا ہوتا۔ جنرل کیانی کو بار بار پکارا بھی گیا لیکن انہوں نے مالاکنڈ میں دہشت گردی کے خلاف فاتحانہ جنگ لڑ کر یہ جواب دیا کہ فوج اپنی اصل سمت کو مقدم رکھے گی۔ صوبائی، لسانی اور سیاسی جھگڑوں کے علاوہ دہشت گردی نے پاکستان کو اس مقام پر پہنچا دیا ہے کہ اسے اپنے وجود کے بقا کی جنگ درپیش ہے۔ یہ جنگ فوج کے سوا کوئی لڑ سکتا ہے، نہ جیت سکتا ہے۔

جنرل ضیاء الحق اور جنرل پرویز مشرف نے فوج کا عہدہ اور ادارہ اپنی ذات کیلئے استعمال کر کے سیاسی کارکنوں اور عوام پر قسم قسم کے ظلم ڈھائے۔ ضیاالحق نے بھٹو جیسے تاریخ ساز لیڈر سمیت بے شمار بے گناہ سیاسی کارکن قتل کیے۔ پرویز مشرف، اکبر بگٹی اور لال مسجد کی بچیوں سمیت قتل کی سینکڑوں وارداتوں کے مجرم تھے۔ انہیں یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ جب

بینظیر بھٹو کا قتل ہوا۔ وہ ملک کے صدر تھے۔ کیا بھٹو اور بینظیر سمیت وہ سارے خون معاف کئے جا سکتے ہیں جو حق کی راہ میں بہائے گئے۔ کیا وہ ظلم بھلائے جا سکتے ہیں جو ہزاروں افراد نے ٹارچر سیلوں اور جیلوں میں سہے یا وہ سارے آنسو معاف کر دیں جو ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں نے اپنے پیاروں کیلئے بہائے۔

میاں نواز شریف کا یہ مطالبہ درست ہے کہ پرویز مشرف کے خلاف غداری کا مقدمہ چلنا چاہئے اور اُنہیں ان کے تمام جرائم کی سزا ملنی چاہئے۔ انہوں نے نہ صرف فوج کا قانون توڑا بلکہ ملکی آئین کے خلاف غداری جیسا سنگین جرم کیا۔ کوئی کہتا ہے کہ فوج ناراض ہو جائے گی، کسی کو ڈر ہے کہ امریکہ مخالفت کرے گا۔ کوئی جدہ میں جنرل پرویز مشرف کی آؤ بھگت کو بنیاد بنا کر یہ خبر سنا دیتا ہے کہ سعودی عرب اجازت نہیں دے گا۔ نواز شریف صاحب کو چودہ سال قید ہوئی تھی۔ جلاوطنی قید سے کم سزا نہیں ہوتی۔ ہر قیدی کو معمول میں ملنے والی معافیاں شامل کر لیں تو وہ جیل اور جلاوطنی کے دوران اپنی پوری سزا کاٹ چکے ہیں۔ یہی سزا اُن کے سارے خاندان نے بلاوجہ بھگتی۔ گرفتاری کے بعد اُنہیں اخلاقی مجرموں سے زیادہ تذلیل اور تشدد سہنا پڑا۔ کیا یہ سب کچھ اس لئے معاف کر دینا چاہئے کہ ملزم آرمی چیف اور جنرل تھا اور وہ اپنے ملک کی بربادی کے صلے میں کچھ طاقتور ملکوں کا منظور نظر تھا۔

مجبوریوں اور سفارشوں نے ہاتھ باندھ رکھے ہیں تب بھی آصف زرداری اور میاں نواز شریف کو اپنا اپنا مقدمہ پہلے آرمی چیف کے توسط سے فوج اور پھر امریکی اور سعودی حکمرانوں کے سامنے پیش کرنا اور انصاف مانگنا چاہئے۔

کہیں شنوائی نہ ہو تو دونوں پارٹیاں مل کر اپنے طور پر یہ تو کر سکتی ہیں کہ دو تہائی اکثریت سے ایک قرار داد کے ذریعے 4 جولائی 1977ء، 4 اپریل 1979ء، 12 اکتوبر 1999ء، 3 نومبر 2007ء اور 27 دسمبر 2007ء کو غداری اور قتل جیسے سنگین جرائم کا ارتکاب کرنے والے جنرلوں اور انہیں تحفظ دینے والے ججوں کو قومی غدار قرار دیں اور اس دستاویز کو آئین کا مستقل باب بنا دیں۔ ان مجرموں کا عملی حساب اللہ پر چھوڑیں اور پھر اُن

کے دنیاوی سرپرستوں سے اس ''جسارت'' پر معافی مانگ لیں۔ تاکہ وہ ناراض نہ ہوں۔

ہمت پڑے تو آئین کے اس سیاہ باب کے نیچے یہ فٹ نوٹ بھی لکھ دیں کہ جنرل ضیاء الحق اور جنرل پرویز مشرف کا آئین کے آرٹیکل 6 کے تحت اس لئے ٹرائل نہیں کیا جا سکا کہ ایک فوت ہو چکا تھا دوسرے کو ہمارے خیر خواہ غیر ملکی دوستوں نے ''ہیرو'' کے طور پر قبول کر لیا تھا جنہیں ہم ناراض نہیں کر سکتے تھے۔

■ ■ ■

کالا قانون یا کالی سیاست

23 اکتوبر 2009ء

''پانی پت'' کی ایک اور لڑائی شروع ہوگئی ہے۔ مسلم لیگ (ن) نے قائمہ کمیٹی برائے قانون و انصاف کے ذریعے بل پیش ہونے کا انتظار کئے بغیر قومی اسمبلی میں یہ تحریک جمع کرادی ہے کہ این آر او مسترد کر دیا جائے۔ مسلم لیگ (ق) اسی طرح کی تحریک پہلے ہی سینٹ میں جمع کرا چکی ہے۔ میڈیا اور سیاست کے ''رودالیوں'' نے ایک شور قیامت برپا کر رکھا ہے۔ ''رودالی'' ہندی کا لفظ ہے اور ہمارے طاہر سرور میر کی ''دریافت'' ہے۔ ''رودالی'' رونے دھونے اور ماتم کرنے والوں کی وہ ٹولی ہوتی ہیں جسے کسی سوگ کے مواقع پر اس لئے بلایا جاتا ہے کہ ''محفل'' یادگار بن جائے۔ بھارت میں اس طرح کی ٹولیاں بہت عام ہیں تاہم یہ کاروبار پاکستان میں بہت ہی محدود تھا پھر اللہ کے فضل سے نجی چینلوں پر ''رودالی'' نسل کے ٹاک شوز اتنے مقبول ہوئے کہ ایک ایک آواز 18 کروڑ عوام کا متفقہ فیصلہ بن گئی۔ کیری لوگر بل کو جان کیری کے چورن کی مدد سے ہضم کرنے کے بعد اب فلم ''این آر او'' ''شرطیہ نئے پرنٹ کے ساتھ'' سینما گھروں میں دوبارہ لگی ہوئی ہے۔ یہ فلم پہلے بھی خوب چلی تھی 18 اکتوبر کو کراچی میں محترمہ بینظیر کے استقبال 27 دسمبر کو لیاقت باغ راولپنڈی میں شہادت اور 8 فروری کے عام انتخابات میں پیپلز پارٹی کو سب سے زیادہ نشستیں ملنے کے بعد ڈبوں میں بند ہوگئی تھی۔ لیکن اب اس کے نئے پرنٹ کی نمائش بڑی دھوم دھام سے جاری ہے۔ ایک طے شدہ حکمت عملی کے تحت ایسی فضا پیدا کر دی گئی ہے جیسے تاریخ پاکستان میں این آر او سے بڑا سانحہ کبھی رونما نہ ہوا ہو، اس ملک میں آئین توڑے

گئے۔ ججوں سے پی سی او کے تحت حلف لئے گئے۔ عوامی لیڈروں کو پھانسیاں اور جلا وطنیاں دی گئیں۔ قید خانوں میں ڈالا اور قتل کیا گیا۔ لال مسجد جیسے سانحے رونما ہوئے۔ انتخابات میں کھلی دھاندلی ہوتی رہی۔ کیا کیا نہیں ہوا لیکن وہ سب کچھ ماضی کا حصہ سمجھ کر فراموش کر دیا گیا ہے۔ کچھ یاد رہ گیا ہے تو وہ صرف یہ این آر او۔ منتخب ارکان کو اخلاقی دباؤ میں لایا جا رہا ہے کہ وہ اس ''برائی'' کے حق میں ووٹ نہ ڈالیں۔ کہا جا رہا ہے کہ قانون منظور کرنے سے پارلیمنٹ پر کوئی ایسا داغ لگ جائے گا جو کبھی نہیں مٹ سکے گا گویا یہ کوئی ایسا داغ ہے جس سے آج تک کی ہر پارلیمنٹ محفوظ رہی ہے۔ سیاستدانوں کو خبردار کیا جا رہا ہے کہ وہ دنیا بھر میں بدنام ہو جائیں گے...... سارا ایجنڈا محض سیاسی ہے لیکن اخلاقیات کو بنیاد بنا کر ایک ایسا طوفان کھڑا کیا جا رہا ہے کہ ارکان پارلیمنٹ سہم جائیں۔ وہ پارٹیاں بھی ڈر جائیں، جنہوں نے اسی این آر او کے مقدمے کا وہ فیصلہ مان لیا تھا جو عوام نے اپنے ووٹوں سے سنایا۔ موجودہ پارلیمنٹ میں ایک ڈیڑھ کے سوا شاید ہی کوئی ایسی سیاسی جماعت ہو جس نے جنرل (ر) پرویز مشرف سے ایک یا دوسرے طریقے سے کوئی رعایت یا ''مروت'' حاصل نہ کی ہو لیکن وہ اپنا اپنا ماضی قریب فراموش کر کے صرف پیپلز پارٹی کے پیچھے لگی ہوئی ہیں۔ وجہ شاید ''مائنس ون'' کا وہ خواب ہے جس کے نتیجے میں ''پلس ون'' کیلئے راستہ ہموار ہو سکتا ہے۔ 88ء کا منظر 90ء والے منظر میں تبدیل نہ ہو تو انہیں 99ء کا منظر بھی قبول ہے۔ یعنی پلس کچھ بھی ہو ''ون'' کو مائنس ضرور ہونا چاہیے۔

این آر او امریکی دباؤ کے تحت ایک سیاسی ''ڈیل'' کے طور پر وجود میں آیا تھا۔ کہانی بہت طویل ہے لیکن میں اسے مختصر کرنے کی کوشش کروں گا۔ محترمہ بینظیر کی دوسری حکومت کو برطرف کرنے کے بعد ''مقدمہ سازی'' کی ابتدا لغاری صاحب کے نگران دور میں ہوئی۔ نگران حکومت مسلسل محترمہ کی کردارکشی میں مصروف رہی۔ انہیں ایک ادھوری سی انتخابی مہم پر قناعت کرنا پڑی۔ پیپلز پارٹی کا ووٹ بنک خراب کرنے کیلئے لغاری صاحب نے اپنے امیدوار بھی کھڑے کئے جن کا تعلق پارٹی کے ناراض گروپ سے تھا اور نشان غالباً ''تانگہ''

تھا۔ انتظامیہ اور نگران حکومتوں نے ''باریک'' کام کر کے پیپلز پارٹی کو اس بری طرح ہرایا کہ پنجاب اسمبلی میں اسے صرف ایک نشست اور قومی اسمبلی میں تقریباً 18 نشستیں ملیں۔ باقی تفصیل مجھے یاد نہیں۔ میاں نواز شریف دوتہائی اکثریت کے ساتھ وزیراعظم بنے اور سینیٹر سیف الرحمٰن کو بینظیر اور آصف زرداری کے احتساب پر لگا دیا پھر الزامات اور مقدمات کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ چل نکلا۔ جسٹس ملک قیوم کی سربراہی میں احتساب بنچ نے ایک مقدمے میں محترمہ اور آصف زرداری کو سزا بھی سنائی۔ فیصلے سے ایک دو دن پہلے بینظیر صاحبہ عدالت کی اجازت سے ملک سے باہر جا چکی تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ بروقت روانگی ملک قیوم صاحب ہی کی ''مروت'' کا نتیجہ تھا بعد میں اس فیصلے کے حوالے سے ملک صاحب اور سیف الرحمٰن کی ٹیپ شدہ گفتگو کا سکینڈل منظر عام پر آیا اور ملک قیوم کو مستعفی ہونا پڑا۔

12 اکتوبر 1999ء کو حکومت کا تختہ الٹنے کے بعد جنرل پرویز مشرف نے شریف خاندان کو جلاوطن کر کے فتویٰ دے دیا تھا کہ محترمہ اور میاں صاحب دونوں ماضی کا حصہ بن چکے ہیں، واپس نہیں آ سکیں گے۔ نواز شریف صاحب سعودی عرب میں پابند تھے۔ محترمہ جلاوطنی کے دوران یورپ خصوصاً امریکہ میں مشرف حکومت کے خلاف مسلسل مہم چلاتی رہیں۔ 2002ء کے انتخابات میں پیپلز پارٹی دھاندلی کے باوجود دوسری بڑی پارٹی بن کر قومی اسمبلی میں آئی۔ مشرف صاحب مخدوم امین فہیم کو وزیراعظم بنانے کیلئے تیار تھے لیکن بیرون ملک محترمہ بینظیر اور جیل میں بیٹھے ہوئے آصف زرداری نے اس ''مائنس بھٹو'' فارمولے کو مسترد کر دیا۔ جنرل صاحب نے پیپلز پارٹی کے ارکان توڑ کر میر ظفر اللہ جمالی کی قیادت میں اپنی مرضی کی حکومت بنوا لی۔ آصف زرداری رہا ہو کر امریکہ گئے تو بینظیر صاحبہ کی اس طویل لابنگ اور جدوجہد کے نتائج برآمد ہونے شروع ہوئے جس کا ٹارگٹ مشرف کی وردی اتروانا، منصفانہ عام انتخابات کا انعقاد اور جمہوریت کی بحالی تھا۔

بعد میں جو کچھ ہوا، اسے ''ڈیل'' کہیں تب بھی ٹھیک ہے اور امریکہ کا دباؤ یا حکم کہہ لیں تو بھی کوئی ہرج نہیں۔ پرویز مشرف صاحب پیپلز پارٹی کے ساتھ معاملات طے کرنے پر آمادہ

کر لئے گئے تھے۔ آخری فیصلہ وزیراعظم (شوکت عزیز) ہاؤس میں ہونے والی اس میٹنگ میں ہوا۔ جس میں مسلم لیگ (ق) کے صدر چودھری شجاعت حسین اور کابینہ کے کچھ اہم ارکان شریک تھے۔ اس اجتماع کی ''صدارت'' اور رہنمائی کیلئے جنرل پرویز مشرف بہ نفس نفیس ایوان وزیراعظم میں آئے۔ ایک معتبر ذریعے کے مطابق اندر کی کارروائی کا خلاصہ یہ تھا کہ مشرف صاحب نے کہا کہ ہماری جو میٹنگز وغیرہ (تفصیل بتائے بغیر) ہوئی ہیں۔ ان میں تین نکات سامنے آئے ہیں۔ وردی اتارنا، تیسری ٹرم کیلئے وزیراعظم بننے پر پابندی کا خاتمہ۔ بینظیر صاحبہ، زرداری اور ساتھیوں کے خلاف مقدمات کا خاتمہ۔ پہلی شرط کا تعلق مجھ سے ہے اور میں نے مان لی ہے۔ باقی دو شرطوں میں سے ایک ماننی ہے۔ ان میں سے کونسی قبول ہے۔ آپ فیصلہ کر لیں۔ ''عوامی'' اور حکومتی طاقت سے ''چور'' حکمران جماعتیں آئندہ دو وزرائے اعظم کا فارمولا پہلے ہی طے کر چکی تھیں۔ جس کے مطابق صدارت کے 5 سال گزارنے کے بعد خود مشرف صاحب نے ق لیگ کا تیسرا وزیراعظم بننا تھا۔ دوسرے لفظوں میں مشرف اور اجلاس کے دوسرے شرکاء کو یقین تھا کہ ملک ان کی مٹھی میں ہے۔ اتفاق رائے سے طے ہوا کہ مقدمات کے خاتمے والی شرط قبول کر لی جائے۔ تیسری مرتبہ وزیراعظم بننے پر پابندی اٹھانے سے عوام تذبذب میں مبتلا ہوں گے اور پیپلز پارٹی جیت جائے گی۔ آرڈیننس کے عنوان میں لفظ Reconciliation (مفاہمت) شامل کرانے کی تجویز وسیم سجاد کی طرف سے آئی۔ جو چند دن پہلے این آر او کو پارلیمنٹ میں لانے کے موقع پر ''شیم شیم'' کے نعرے لگانے میں پیش پیش تھے۔ یہ منظر ہمارے شاندار سیاسی کلچر کا نادر نمونہ ہے اس لئے ''سبحان اللہ'' کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے۔

این آر او کی ڈرافٹنگ کیلئے اوپر والوں (جو اللہ کے بعد دوسرا الف سمجھے جاتے ہیں) سے رابطے رکھنے اور پیپلز پارٹی کی ٹیم کے ساتھ تفصیلات طے کرنے والی کمیٹی کے سربراہ مشاہد حسین سید تھے۔ یہ ''کالا قانون'' صدارتی آرڈیننس کی شکل میں جاری ہوا۔ وزیراعظم اور وفاقی کابینہ نے منظوری دی اور کابینہ کے مذکورہ اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے وزیراعظم

شوکت عزیز نے فرمایا ''این آر او قومی سیاست میں برداشت، رواداری، مفاہمت پیدا کرنے اور سیاسی انتقام کے خاتمے میں اہم قدم ثابت ہوگا''۔ بعد میں مشاہد حسین سید اس وقت وزیر قانون زاہد حامد اور وزیر اطلاعات محمد علی درانی نے ایک مشترکہ پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ''این آر او امریکہ اور بیرونی دباؤ پر نافذ نہیں کیا گیا یہ فیصلہ ملک وقوم کے وسیع تر مفاد میں کیا گیا ہے۔ ہم نے ملک کے اندر ایک نئے سیاسی کلچر کی بنیاد رکھی ہے۔ اب احتساب کو سیاسی ہتھیار کے طور پر استعمال نہیں کیا جا سکے گا''۔

''کالی سیاست'' کا کمال دیکھئے کہ آج کل زاہد حامد صاحب بھی ٹی وی سکرین پر اپنا ''سچ'' یوں بیان کرنے میں کوئی عار نہیں سمجھتے کہ وہ تو اس کالے قانون سے لاتعلق تھے۔ احتجاج کے طور پر وزیراعظم کو استعفٰی بھی پیش کیا تھا لیکن وہ نہیں مانے۔ شوکت عزیز صاحب استعفٰی واپس کروانے کیلئے یقیناً اپنے اس عظیم وزیر قانون کے پاؤں پر گر گئے ہوں گے ورنہ وہ جھنڈے والی کار میں بیٹھ کر گھر واپس آتے نہ مشترکہ پریس کانفرنس میں شریک ہوتے۔ زاہد حامد اصولوں کی سیاست کا زندہ نمونہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعد میں جب مسلم لیگ (ق) نے انہیں ٹکٹ نہیں دیا تو مسلم لیگ (ن) نے ان کی عظمت کو یوں سلام پیش کیا کہ اپنا ٹکٹ دے دیا اور وہ الیکشن جیت بھی گئے، مسلم لیگ (ن) کی چھلنی کے سوراخ اتنے باریک تھے کہ ملک قیوم کا بھائی ہونے کی وجہ سے پرویز ملک تو ان میں پھنس گئے مگر زاہد حامد ہوا کی طرح چپکے سے گزر گئے۔

اخباروں کی فائلیں اتنی وزنی ہوتی ہیں کہ سیاستدانوں کا ماضی ان کے نیچے دب کر اس طرح گم ہو جاتا ہے کہ خود انہیں بھی یاد نہیں رہتا۔

■■■

26 اکتوبر 2009ء میں لکھنا شروع کرنے لگا تھا کہ سابق دور کی ایک اہم شخصیت کی کال آ گئی۔ میرے یہ دوست وزیراعظم ہاؤس کی اس فیصلہ کن میٹنگ میں موجود تھے جس میں شرکت کیلئے جنرل پرویز مشرف خود چل کر آئے تھے۔ میرے اس مہربان نے بتایا کہ یہ اطلاع درست نہیں ہے کہ صدارت کی دوسری مدت مکمل کرنے کے بعد پرویز مشرف صاحب خود وزیراعظم بننے کا ارادہ رکھتے تھے۔ گفتگو کی مزید تفصیل یہ ہے کہ سابق صدر نے اپنی محبوب حکمران جماعت کے لیڈروں کو بار بار سمجھایا کہ مقدمات ختم کرنے کی شرط ماننے کے بجائے تیسری مرتبہ وزیراعظم بننے کی پابندی اٹھانا بہتر ہو گا۔ محترمہ بینظیر مقدمات کی زنجیروں میں بندھی رہیں گی اور انہیں قابو میں رکھنا آسان ہو گا۔ قاف لیگی قیادت کی جوابی دلیل یہ تھی کہ انتخابی مہم میں ''وزیراعظم بینظیر'' اور ''وزیراعظم نواز شریف'' کے نعروں کی گونج سے انتظامیہ متذبذب ہو جائے گی اور ہم مثبت نتائج حاصل نہیں کر سکیں گے۔ ممکن ہے انہیں یہ بھی یقین ہو کہ مقدمات اور کرپشن کا ''ہینڈی کیپ'' محترمہ بینظیر کی انتخابی مہم پر اتنا بڑا بوجھ بن جائے گا کہ پیپلز پارٹی ''گیٹ'' سے (یہ بھی ریس کی اصطلاح ہے اور گھوڑوں کے سٹارٹنگ پوائنٹ کیلئے استعمال ہوتی ہے) نکلتے وقت ہی اتنا پیچھے رہ جائے گی کہ اس کیلئے ''وننگ پوسٹ'' پر دوسرا نمبر قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہے گا۔

ریس میں بہت ہی تگڑے گھوڑے کو چھوٹی کلاسوں میں ساتھ دوڑنے والے گھوڑے کے برابر لانے کیلئے اس پر وزن باندھ دیا جاتا ہے۔ یہ عمل ''ہینڈی کیپ'' کہلاتا ہے۔ چودھری برادران کو تو شاید علم نہ ہو لیکن مشرف صاحب کے معتمد خصوصی طارق عزیز صاحب لاہور ریس کلب کے چیئرمین ہیں، اس ترکیب یا طریق کار سمیت گھوڑوں کی نسلوں وغیرہ کے حافظ ہیں۔ (ممکن ہے اچھے تعلقات کے دنوں میں طارق صاحب نے چودھری صاحبان کو ہینڈی کیپ بنانا سمجھا دیا ہو)۔ حکمران جماعت کو یقین دلایا گیا تھا کہ محترمہ بینظیر کی واپسی کافی مشکل ہو گی اور میاں نواز شریف کے الیکشن سے پہلے آنے کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ سعودی حکام خود اسلام آباد آ کر انہیں زبردستی جدہ لے گئے ہیں اور معاہدے کی دس

سالہ مدت پوری کرائے بغیر انہیں واپس نہیں آنے دینگے۔ این آر او جاری ہونے پر مسلم لیگ (ق) کے صدر چودھری شجاعت حسین کے کچھ فرمودات ملاحظہ ہوں۔ ''پیپلز پارٹی نے کھیل کھیلا ہم نے بھی کھیل کھیلا اور جیت گئے۔ رات گئی، بات گئی۔ این آر او کا مقصد سیاسی فائدہ حاصل کرنا تھا، حکومت نے اس آرڈیننس کے ذریعے اپوزیشن میں پھوٹ ڈال دی ہے''۔ یہ ہے سیاستدانوں کا وہ ماضی جو اخبارات کی وزنی فائلوں کے نیچے دب کر گم ہو جاتا ہے اور خود سیاستدان بھی اسے یاد رکھنے کی اخلاقی پابندی سے آزاد ہو جاتے ہیں۔ چودھری شجاعت یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ اس گناہ میں شریک نہیں تھے۔ وہ اخبار ریکارڈ سے نکلوا کر دیکھا جا سکتا ہے جس میں مشاہد صاحب، درانی صاحب اور زاہد حامد صاحب کی وہ مشترکہ پریس کانفرنس شائع ہوئی جس میں بتایا گیا تھا کہ ''این آر او ملک وقوم کے مفاد میں ہے اور ہم نے ملک میں ایک نئے سیاسی کلچر کی بنیاد رکھ دی ہے''۔ یہ پریس کانفرنس تمام اخبارات میں شائع ہوئی اور اس کی فوٹیج ہر ٹیلی ویژن چینل کے پاس موجود ہوگی۔ مشاہد حسین سید صاحب کی خوبی یہ ہے کہ وہ اتنی چابکدستی سے چودھری شجاعت حسین کو اپنے ایجنڈے پر لاتے ہیں کہ وہ اسے ایمان کا حصہ سمجھ کر اپنے آپ پر طاری کر لیتے ہیں۔ مشاہد صاحب نے ایک بے معنی صدارتی الیکشن لڑ کر چودھری برادران کی ٹوٹی ہوئی پارلیمانی طاقت سے پردہ اٹھایا۔ سید صاحب کا اپنا ایجنڈا صرف یہ تھا کہ آصف زرداری کی کردار کشی کا وہ فریضہ انجام دے سکیں جو اپنا صدارتی امیدوار لانے کے باوجود اس وقت تک مسلم لیگ (ن) کی پالیسی نہیں تھی۔ مجھے شبہ ہے کہ کیری لوٹر بل کی اصطلاح بھی سید صاحب ہی کے زرخیز ذہن کی تخلیق ہوگی۔ ممکن ہے کہ این آر او پر چودھری صاحبان کا ''اباؤٹ ٹرن'' بھی انہی کا کارنامہ ہو۔ میں دونوں چودھری صاحبان (شجاعت اور پرویز الٰہی) کا بہت مداح ہوں۔ میں نے اپنی زندگی میں بہت سے حکمران دیکھے ہیں لیکن یہ دونوں چودھری اس حوالے سے منفرد ہیں کہ انہیں اقتدار جیسے اندھے پن کی کیفیت میں یاد خدا بھی رہتی ہے اور خوف خدا بھی۔ وہ انسان کے درجے سے بلند ہو کر بادشاہ کا روپ اختیار کرتے ہیں نہ اپنے دوستوں، ساتھیوں، سرکاری افسروں اور ملازموں بلکہ عام لوگوں کے

بارے میں ایسے رویے اختیار کرتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو رعایا مان لیں۔

دونوں چودھریوں پر دوسرا بڑا بوجھ سابق صدر فاروق لغاری اور فیصل صالح حیات ہیں۔ یہ دونوں ایسے وقت میں چودھری برادران کے ساتھ کھڑے رہے جب پرویز مشرف ان کی سیاسی تدفین پر تلے ہوئے تھے۔ چودھریوں پر یہ بوجھ برقرار رکھنے میں صدر زرداری کا اپنا قصور بھی ہے۔ انہوں نے مفاہمت کی پالیسی کے تحت کیا کچھ نہیں بھلایا۔ جیلیں بھلا دیں، قتل فراموش کر دیئے، ہر ظلم اور زیادتی کو تقدیر کا حصہ سمجھ کر قبول کر لیا۔ خود پیش قدمی کر کے چودھری صاحبان کے ساتھ قتلوں کی دشمنی کو سیاسی تعلق میں بدل لیا۔ کاش انہوں نے لغاری صاحب اور فیصل صاحب کے دلوں میں بھی جھانک کر دیکھ لیا ہوتا۔ مجھے یقین ہے کہ ان دونوں کے دلوں پر ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی کا داغ بھی ہوگا اور محترمہ بینظیر بھٹو کے قتل کی خراش بھی۔ چغل خور اور خوشامدی اتنے بڑے فنکار ہوتے ہیں کہ باپ کو بیٹے سے اور بیٹے کو باپ سے قتل کروا دیتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی غلط فہمیوں اور گلے شکووں، سیاسی مجبوریوں یا مصلحتوں، غصہ یا حق اور ناحق کے ادراک پر اختلاف کی وجہ سے عام زندگی اور سیاست میں کیا کیا کچھ تبدیل نہیں ہوتا۔ میاں نواز شریف جلا وطن ہوتے وقت جاوید ہاشمی صاحب کو اپنا قائم مقام نامزد کر گئے تھے۔ ہاشمی صاحب خود سب سے آگے کھڑے ہو کر لڑے۔ جیلوں میں سڑتے رہے، ان کے پورے خاندان کو قسم قسم کے دکھ سہنے پڑے۔ آج انہیں پارٹی میٹنگ میں پچھلی قطاروں پر کوئی خالی کرسی ڈھونڈنی پڑتی ہے۔ پیپلز پارٹی کی سیاست کے ابتدائی اور انتہائی خطرناک دور میں ہر قاتلانہ حملے کے موقع پر غلام مصطفٰی کھر بھٹو صاحب کی ڈھال بن کر اپنے آپ کو موت کیلئے پیش کر دیا کرتے تھے۔ لڑانے کے ماہروں نے زندگی اور موت کا یہ رشتہ بھی تڑوا دیا۔ جے اے رحیم کتنے محترم تھے۔ حنیف رامے پیپلز پارٹی کے حسنین ہیکل کہلاتے تھے۔ انہوں نے بھٹو کا پیغام اس وقت گھر گھر پہنچایا جب سرکاری اور غیر سرکاری اخبارات انہیں اندر کے صفحات پر سنگل کالم چھاپتے وقت بھی سو بار سوچتے تھے۔ آفتاب احمد شیر پاؤ اس حیات محمد شیر پاؤ کے بھائی تھے جنہوں نے پیپلز پارٹی کیلئے جان قربان کر دی۔

صدر زرداری نے بڑے بڑے کمالات دکھائے ہیں۔ دشمنوں کو دوست بنا لیا لیکن کیا وجہ ہے کہ وہ اعتزاز احسن، ناہید خان، صفدر عباسی اور دوسرے پرانے ساتھیوں یعنی ''اپنوں'' کے چھوٹے چھوٹے گلے شکوے، نخرے یا اختلاف برداشت نہیں کر سکے۔ مخدوم خاندان نے ہر برے وقت میں بھٹو صاحب، بینظیر صاحبہ اور پیپلز پارٹی کا ساتھ دیا۔ امین فہیم صاحب کا منتہائے سیاست وزارت عظمیٰ ہی ہوتی تو وہ راؤ سکندر اقبال گروپ میں مزید چند ارکان کا اضافہ کر کے 2002ء میں وزیراعظم بھی بن جاتے اور 5 سال بھی پورے کرتے۔ وہ ناراض ہو کر بھی کسی سازش میں ملوث نہیں ہوئے، راضی ہو کر خود کو وزیروں کے ہجوم میں گم کر لیا۔ یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے پچھتاوے یا مشکل کی کسی گھڑی میں زرداری صاحب کے سامنے بیٹھ کر منیر نیازی کی نظم کا یہ مصرعہ بھی نہیں پڑھا ہو گا ''ہم سے بچھڑ کر کیا تجھے سکھ کا خزانہ مل گیا'' ناراض رشتوں کے حوالے سے پنجابی کی ایک کہاوت کا ترجمہ کچھ یوں ہے کہ گردن داؤ پر لگی ہو تو اپنے ٹوٹے ہوئے بازو ہی اسے بچانے کیلئے آگے آتے ہیں کوئی پرایا نہیں آتا۔

میں اصل موضوع کو چھوڑ کر کہیں سے کہیں نکل گیا ہوں۔ این آر او پر چودھری شجاعت حسین کا یہ ابتدائی تبصرہ اور تجزیہ کہ تیسری مرتبہ وزیراعظم بننے کی پابندی کے بجائے مقدمات ختم کرنے کی شرط مان کر سیاسی کھیل انہوں نے کھیلا اور جیتا، کافی حد تک درست تھا۔ آرڈیننس جاری ہوتے ہی الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا پر ''سیاپا'' شروع ہو گیا، یہ فلم اب نئے پرنٹ کے ساتھ دوبارہ لگی ہوئی ہے۔ تیسرا نیا پرنٹ قومی اسمبلی میں این آر او پر بحث کے وقت جاری ہو گا اور چوتھا سپریم کورٹ میں این آر او کے خلاف پٹیشن کی سماعت کے دوران، پانچواں فیصلے کے بعد، جو ہمارے ''کالینکر'' پہلے ہی سنا چکے ہیں اور سناتے چلے جا رہے ہیں۔ ''کالینکر'' صحافت کی لغت کیلئے ایک نیا لفظ ہے جو نذیر ناجی صاحب نے بیک وقت اینکری اور کالم نویسی کرنے والے اس گروہ کیلئے تخلیق کیا ہے جو پیپلز پارٹی کے معاملے میں جھوٹے فتوے دیتا ہے لیکن اپنی محبوب سیاسی جماعتوں کی غلطیوں یا گناہوں کو پس منظر میں دفن کر کے

ثواب کماتا ہے۔

شجاعت صاحب کی دوسری پیش گوئی بھی درست ثابت ہوئی، اس وقت کی اپوزیشن میں پھوٹ پڑ گئی۔

جنرل (ر) پرویز مشرف کے اس ''گناہ عظیم'' میں اپنی علامتی شمولیت پر چودھری شجاعت صاحب نے 6 جولائی 2009ء کو قوم سے معافی مانگ لی تھی۔ وہ سابق دور کے ہر گناہ وثواب میں شریک تھے۔ مشرف صاحب نے دو مرتبہ آئین توڑا دو مرتبہ پی سی او جاری کر کے سپریم کورٹ سے اپنے حق میں فیصلے لئے۔ 3 سال بلاشرکت غیرے حکومت کی۔ پھر دھاندلی اور ہارس ٹریڈنگ کر کے 5 سال کیلئے ذاتی جمہوریت بنا لی جس میں اکبر بگٹی اور لال مسجد جیسے قتل عام بھی ہوئے۔ 9/11 کے بعد انہوں نے امریکہ کی ہر شرط مان کر دہشت گردی کو اپنے ملک کے اندر درآمد کر لیا۔ ہم لہولہان ہیں پھر بھی اپنے نجات دہندہ کے بیشتر ''احسانات'' کو برا نہیں کہہ سکتے۔ واحد ناقابل معافی گناہ یہ بدبخت این آر او تھا جس پر چودھری صاحب کو سب سے بڑی معافی مانگنی پڑی ہے۔ ان کی دریا دلی اور مروت کا کمال دیکھئے کہ اس گناہ عظیم کے باوجود انہوں نے باوردی پرویز مشرف کو مزید 5 سالہ مدت کیلئے صدر منتخب کرا دیا۔ انہوں نے اپنا پاکیزہ ووٹ بھی 61 سالہ تاریخ پاکستان کا ''شاہ کالا'' (کالے قانون سے بھی کالا) قانون بنانے والے کے منہ پر دے مارا......واہ ہمارے پیارے چودھری صاحب۔

■■■

27 اکتوبر 2009ء

کائیں کائیں جاری ہے۔

کوؤں نے آسمان سر پر اٹھا رکھا ہے۔ پنجابی کی ایک کہاوت ہے ''کاواں دے آکھیاں ڈھورنئیں مردے'' (کوؤں کے کہنے پر مویشی نہیں مرتے) لیکن

ہمارے ''کلینکر وں'' کو یقین ہے کہ وہ وفاق اور صوبوں سے 481 ووٹ لیکر صدر منتخب ہونے والے اور سب سے زیادہ نشستیں جیت کر وفاق اور صوبوں میں نمبر ایک یا نمبر دو پوزیشن لیکر حکومتیں بنانے والی جماعت کے شریک چیئر پرسن کو استعفٰی دینے پر مجبور کر سکتے ہیں یا کوئی نیا ضیاء الحق جنم دیکر کسی آدھی رات کو ایک اور تابوت گڑھی خدا بخش روانہ کروا سکتے ہیں۔ ہٹلر کے وزیر اطلاعات گوئبلز نے ٹھیک کہا تھا ''جھوٹ بار بار اور اتنی بار بولو کہ سننے والے اسے سچ مان لیں'' کیری لوگر بل پر باقاعدہ منادی کرا دی گئی تھی کہ غیرت کا سوال تھا اس لئے پوری قوم نے اسے مسترد کر دیا ہے۔ قومی اسمبلی میں کھل کر بحث ہوئی۔ ہر آنکھ میں خون اترا ہوا تھا۔ مخلوط حکومت میں شامل پیپلز پارٹی کی اتحادی جماعتیں متحدہ قومی موومنٹ، اے این پی اور جمعیت علمائے اسلام (ف) متذبذب اور لاتعلق رہیں۔ امریکہ سے آنے والے ایک وضاحتی بیان اور وزیر خارجہ شاہ محمود قریشی کی تقریر کے بعد قومی اسمبلی کا اجلاس ملتوی کر دیا گیا۔ اپوزیشن کے بل پر ووٹنگ کرانے کیلئے نئی ریکوزیشن بھی نہیں دی گئی۔ ایک آدھ دن بعد وفاقی کابینہ نے اس بل کو باضابطہ طور پر قبول کر لیا۔ قوم نے کروٹ تک نہیں بدلی، ''کلینکر وں'' نے بھی ''کائیں کائیں'' کا موضوع بدل کر نیا فتوٰی صادر کر دیا۔ جس کا ایک سطری خلاصہ یہ ہے کہ این آر او اتنا کالا قانون ہے کہ اسے پارلیمنٹ سے منظور کروایا گیا تو اس پر ایک ایسا داغ لگ جائے گا جو کبھی نہیں مٹ سکے گا۔ ہماری موجودہ بلکہ حاضر سروس پارلیمنٹ اتنی داغ پروف ہے کہ اس کے ارکان نے آئین شکن جنرل (ر) پرویز مشرف کی صدارت قبول کر کے حلف اٹھالیا لیکن اس پر داغ تو کیا ذرا سی میل بھی نہیں لگی۔ اس کے وزیراعظم اور دونوں بڑی پارٹیوں پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ ن کے ارکان (کالی پٹیاں باندھ کر) ایوان صدر گئے اور پرویز مشرف سے وزارتوں کا حلف لیا لیکن تب بھی ان کے اپنے دامن پر کوئی دھبہ لگا نہ اس پارلیمنٹ کی ''چٹی چادر'' پر۔ اسی پارلیمنٹ میں کھڑے ہو کر وزیراعظم یوسف رضا گیلانی نے یہ شرط سنائی کہ ''متفقہ قرار داد'' لے آئیں، پرویز مشرف کے خلاف غداری کا مقدمہ درج کرا دونگا'' نتیجہ کیا نکلا۔ مسلم لیگ (ن) کے سوا تمام سیاسی جماعتوں کو سانپ سونگھ گیا۔ آخر میں

سعودی عرب کے شاہ عبداللہ نے یہ معاملہ ہمیشہ کیلئے نبٹا دیا۔ خدا کا شکر ہے کہ ہماری یہ مقدس پارلیمنٹ بے داغ کی بے داغ رہی۔ این آر او کا مسئلہ اٹھنے سے پہلے اسی پارلیمنٹ نے کابینہ کے فیصلے کے بعد کیری لوگر بل پر خاموشی اختیار کر لی اور اپنے چکنے اور شفاف بدن پر میل تک نہیں لگنے دی۔

اس پارلیمنٹ کو این آر او کے انمٹ داغ سے بچانا اس لئے ضروری ہے کہ نہ صرف پارلیمنٹ بلکہ پوری قوم دنیا بھر میں بدنام ہو جائے گی۔ آگے سنئے... گزشتہ روز ترک وزیراعظم طیب اردگان نے اس پارلیمنٹ سے خطاب کرتے ہوئے یہ کہہ دیا کہ محترمہ بینظیر دنیا کی عظیم رہنما تھیں۔ ان کی شہادت پر دنیا بھر کو دکھ ہوا۔ ایک دوست ملک کے سربراہِ حکومت کو ٹوکنا بدتہذیبی اور بدتمیزی ہے لیکن ایوان میں قوم کے نمائندوں کو یہ حقیقت ضرور بیان کر دینی چاہیے تھی کہ جس ''مقتولہ'' کو انہوں نے عظیم رہنما قرار دیا ہے وہ این آر او جیسے گناہِ عظیم کا ارتکاب کر کے پوری قوم اور اس پارلیمنٹ کو امتحان میں ڈال گئی تھیں اور اُن کے سر پر لگنے والی گولی کے زخم سے خون بھی اتنا کم نکلا کہ این آر او والا داغ نہیں دھل سکا۔

متحدہ قومی موومنٹ اور اُس کے قائد الطاف حسین صاحب کے اکثر مداح یہ کہتے ہیں کہ الطاف حسین صاحب اس ملک کے واحد حق پرست سیاسی رہنما ہیں۔ چند دن پہلے میں نے ایک دوست سے صرف ایک سوال کیا تھا کہ کیا الطاف حسین بھی جھوٹ کے سیلاب کے سامنے اپنے اُس سچ کا بند باندھنے سے گریز کر جاتے ہیں جو اُنہیں تمام جزیات کے ساتھ معلوم ہو۔ انہوں نے جواب دینے کے بجائے متحدہ اور اس کے قائد کی تعریف شروع کر دی اور پھر موضوع بدل دیا۔

میرے کالم کی یہ قسط الطاف حسین صاحب کی نذر ہے۔ میں این آر او کا پس منظر، اسے قبول کرنے کی مجبوری اور کچھ حقائق انہیں یاد دلانا چاہتا ہوں جو شاید میری محدود معلومات سے کہیں زیادہ صحت اور لفظ بہ لفظ یا لمحہ بہ لمحہ تفصیل کے ساتھ انہیں پہلے ہی معلوم ہوں گے۔ متحدہ قومی موومنٹ اس مشرف شوکت عزیز حکومت میں شامل تھی جس نے قوم کو شرمسار کرنے

کیلئے اس پر این آر او جیسی ''توہین'' مسلط کر دی۔

محترمہ بینظیر بھٹو نے این آر او اس لئے قبول کیا تھا کہ انہیں یقین تھا کہ ایک باوردی ڈکٹیٹر کو عوامی طاقت کے ذریعے نہیں نکالا جا سکتا۔ انہوں نے امریکی ارباب اختیار کو قائل کر کے ایک ''ڈیل'' بنائی۔ انہیں عندیہ دیا کہ مشرف وردی اتار دیں تو وہ صدر کے طور پر قابل قبول ہو سکتے ہیں۔ وہ ''جن'' کو اس ''طوطے'' سے محروم کرنا چاہتی تھیں جس میں اس کی اصل طاقت تھی۔ باقی دو شرطیں یہ تھیں۔ تیسری بار وزیراعظم بننے پر پابندی ختم کر دی جائے اور وہ مقدمات ختم کر دیئے جائیں جو لغاری اور نواز شریف دور میں محترمہ بینظیر، آصف زرداری اور پیپلز پارٹی کے دوسرے لیڈروں یا بیوروکریٹس پر بنائے گئے تھے اور جن کی پاداش میں (قید کی سزاؤں کے سلسلے میں جیل رولز کے مطابق) زرداری صاحب 21 سال کی قید پہلے ہی کاٹ چکے تھے۔ خود محترمہ نے مشرف کا پورا دور جلاوطنی میں گزارا تھا۔ مشرف سے کہا گیا تھا کہ دو میں سے ایک شرط مان لیں۔ محترمہ کی اپنی ترجیح یہ تھی کہ تیسری بار وزیراعظم بننے پر پابندی ختم کر دی جائے۔ میں نے وزیراعظم ہاؤس میں ہونے والی جس میٹنگ کا پچھلے کالم میں ذکر کیا تھا اس کی تصدیق شوکت عزیز کابینہ کے سابق رکن اور ق لیگ کے ہم خیال گروپ کے لیڈر ہمایوں اختر خان نے دو دن پہلے ایک انٹرویو میں کی ہے۔ وردی لازمی شرط تھی، باقی دو میں سے ایک شرط کا انتخاب پرویز مشرف، ان کی حکومت اور پارٹی کے اختیار میں تھا۔ مشرف صاحب وردی اتارنے والی شرط ماننے کا اعلان کر کے وزیراعظم ہاؤس سے رخصت ہو گئے۔ ہمایوں اختر کا کہنا ہے کہ تیسری مرتبہ وزیراعظم بننے کی شرط اس بنیاد پر مسترد کر دی گئی کہ حکمران جماعت کو ڈر تھا کہ وہ دبئی میں بیٹھی بیٹھی وزیراعظم بنیں گی اور یہاں آن پہنچیں گی۔ دوسری شرط ہی وہ کھیل تھا جس میں حکمران پارٹی کو اپنی جیت نظر آتی تھی۔ دوسرے لفظوں میں شرطوں والی ایک پرچی انہیں زندگی اور اقتدار کی طرف محفوظ راستہ دے سکتی تھی جبکہ دوسری پر بدنامی اور موت (جو یقینی طور پر اس وقت فیصلہ کرنے والوں کو معلوم نہیں تھی) لکھا تھا، حکمران جماعت کے فیصلہ سازوں نے موت کی پرچی نکال کر محترمہ کے ہاتھ میں تھما دی اور انہیں قبول

کرنا پڑی۔ اس ڈیل میں کچھ خفیہ شرطیں بھی تھیں۔ جن میں سے ایک کا انکشاف پرویز مشرف صاحب نے یوں کہہ کر کیا ہے کہ وہ قتل نہ ہوتیں تو میں صدر رہتا اور وہ وزیراعظم ہوتیں۔ اس سیٹ اپ کے ساتھ یقینی طور پر یہ ضمنی شرط بھی منسلک ہوگی کہ 4 نومبر والی عدلیہ خصوصاً چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کو بحال نہیں کیا جائے گا۔ اس ڈیل میں امریکہ دونوں طرف سے ضامن تھا۔ این آر او کی بجائے تیسری بار وزیراعظم بننے پر پابندی اٹھانے والی شرط مان لی جاتی تو محترمہ کے سر پر غیر حاضری میں لٹکائی جانے والی وہ سزائے قید (3 سال) موجود رہتی اور وہ واپس آ کر جیل میں جانے کا خطرہ مول لینے کے بجائے دبئی میں بیٹھی رہتیں۔ میاں نواز شریف کو بھی سعودی عرب سے واپسی کی اجازت نہ ملتی۔ یہ شرط دو تہائی اکثریت کے ساتھ آئین میں ترمیم کے بغیر پوری نہیں کی جاسکتی اس لئے حکمران جماعت نے صاف انکار کر دیا اور مشرف صاحب بھی راضی ہو گئے۔ میرا خیال ہے کہ حکمران جماعت این آر او والی شرط ماننے کے بجائے یہ شرط مان لیتی تو وہ انتخابی مہم میں میاں نواز شریف اور محترمہ بینظیر کی غیر حاضری کی وجہ سے 2002ء سے بھی بہتر نتائج حاصل کر سکتی تھی۔ لیکن بینظیر صاحبہ کی موت کا دن 27 دسمبر 2007ء ہی مقرر تھا اس لئے حکمران جماعت نے بھی وہی پرچی نکالی، جس کی پشت پر اس کی اپنی اور مشرف صاحب کی شکست اور اقتدار سے رخصتی کے مقررہ دن بھی تقدیر نے ہی لکھ رکھے تھے۔

■ ■ ■

28 اکتوبر 2009ء

این آر او صرف کالا ہی نہیں منحوس قانون بھی ہے۔ اس کی وجہ سے پہلے کارساز کراچی اور پھر لیاقت باغ راولپنڈی کی قتل گاہوں میں خون کی ہولی کھیلی گئی۔ کراچی کے استقبال کو شاندار، بے مثال یا تاریخی جیسے کسی روایتی لفظ میں سمیٹنے کے بجائے ایک جملے میں یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ ''آئندہ کبھی کوئی بینظیر آئے گی

نہ ملک کے کونے کونے سے اتنی بڑی خلقت کسی ایک جگہ جمع ہو گی اور نہ ہی محبت اور عقیدت کا کوئی ایسا میلہ لگے گا''۔ اس نا قابل فراموش منظر کو کس نے اور کیوں خون میں نہلا دیا؟ کوئی نہیں جانتا۔ اصل ذمہ دار جو کوئی بھی تھا، پاکستان کی شان آن اور عزت کا رکھوالا ہی ہوگا اور این آر او جیسے کالے قانون کی گمراہ کن پذیرائی برداشت نہیں کر سکا ہو گا۔ اس حملے کا اصل مقصد محترمہ بینظیر بھٹو کو قتل کرنا تھا۔ وہ بال بال بچ گئیں بہر حال ڈر کر پسپا ہو جانے کے بجائے وہ اگلے دن ہی ہسپتالوں میں جا کر زخمیوں کی عیادت کرتی رہیں۔ پھر محترمہ دبئی واپس گئیں اور زرداری صاحب اور بچوں سے آخری ملاقات کر کے لوٹ آئیں۔

ساحر لدھیانوی نے کہا ہے۔

خون پھر خون ہے
ٹپکے گا تو جم جائے گا

پولیس کو یہ شعر شاید یاد ہی ہو۔ ہو سکتا ہے اسی وجہ سے اس نے سب سے پہلے وہ خون دھو ڈالا، اسے جمنے نہیں دیا۔ یہ بھی ممکن ہے کسی نے پولیس کو بتا دیا ہو کہ جمے ہوئے خون کے نیچے انمٹ داغ بھی چھپ جاتے ہیں۔ پولیس کی غفلت سے این آر او والا داغ چھپ جاتا تو کالی سیاست اور صحافت یقیناً ایک انتہائی قیمتی اثاثے سے محروم ہو جاتی۔

جنرل پرویز مشرف اور وزیر اعظم شوکت عزیز نے محترمہ کو خطرات سے آگاہ کر کے وطن واپس آنے سے روکنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ بے بس تھے۔ این آر او کی وجہ سے غیر حاضری میں سنائی جانے والی وہ سزائے قید کالعدم ہو چکی تھی اس لئے وہ ائرپورٹ پر گرفتار کرنے کے جواز سے محروم ہو چکے تھے۔ اپنوں کی التجائیں اور پرایوں کے خدشات نظر انداز کر کے بینظیر صاحبہ آن پہنچیں۔ پھر اسی سعودی حکومت نے، جو میاں نواز شریف کو مبینہ طور پر اسلام آباد سے اغوا کر کے جدہ واپس لے گئی تھی، پرویز مشرف کو راضی کر کے شریف خاندان کو بھی واپس آنے اور انتخابی مہم میں حصہ لینے کی اجازت دلوا دی۔ ہو سکتا ہے کہ اس موقع پر شاہ عبداللہ نے جنرل پرویز مشرف کو یہ تاکید بھی کی ہو کہ اس ''رہائی'' کو این آر او اور محترمہ کی

واپسی کے ساتھ نہ جوڑا جائے۔ میاں صاحبان کی واپسی سے حکمران جماعت مسلم لیگ (ق) کا وہ کھیل کافی بگڑ گیا تھا جس میں انہوں نے یقینی جیت فرض کر رکھی تھی۔ ایک طرف میاں نواز شریف اور شہباز شریف نے انتخابی مہم چلا کر ساری صورتحال ہی بدل کر رکھ دی۔ دوسری طرف محترمہ بینظیر بلوچستان اور سرحد سے ہوتی ہوئی پنجاب میں اپنے پہلے جلسے کیلئے راولپنڈی پہنچ گئیں۔

میرے ایک ذمہ دار اور باخبر دوست کا کہنا ہے کہ جلسہ عام سے ایک دن پہلے ایک انتہائی اہم شخصیت نے انہیں خبردار کیا تھا کہ وہ لیاقت باغ نہ جائیں۔ وہاں سے زندہ واپس آنے کا امکان بہت کم بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ مرنے والے بہت سے راز اپنے سینوں میں لیکر دفن ہو جاتے ہیں۔ بینظیر جیسی بڑی سیاستدان نے تو شاید بہت سی باتیں زرداری صاحب اور اپنے بچوں کو بھی نہ بتائی ہوں۔ سوال یہ ہے کہ محترمہ نے موت کے خطرے کی پروا کیوں نہیں کی۔ ضد کر کے مقتل میں کیوں چلی گئیں۔ میرا اندازہ یہ ہے کہ انہیں اپنے ''اصل جرم'' کی سنگینی کا بھی اندازہ تھا اور یہ بھی معلوم تھا کہ انہیں سزائے موت بھی مل سکتی ہے۔ انہوں نے وردی اتروانے اور وطن واپس آنے کیلئے جو ڈیل، معاہدہ یا وعدے کر لئے تھے، انہیں قبول کرنے اور عمل میں لانے کا نتیجہ ایک ایسی سیاسی موت کے مترادف تھا جس میں ''زندہ ہے بھٹو زندہ ہے'' سمیت وہ سارا قیمتی اثاثہ دفن ہو جاتا جس کی شان پھانسی کے تختوں پر، قید خانوں میں اور طویل جلاوطنیوں میں بھی ماند نہیں پڑی تھی۔ انہیں یاد تھا کہ ذوالفقار علی بھٹو کے بقول ''منتقم مزاج ہاتھی'' حکم عدولی معاف نہیں کرتا۔ انہوں نے سیاسی فنا اور جسمانی موت میں سے اپنے باپ کی طرح دوسرے آپشن کا انتخاب کیا اور تمام وعدے توڑ دیئے۔ اعلان کر دیا کہ پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ (ن) کو عام انتخابات میں پہلے اور دوسرے نمبر پر کامیابی نہ ملی تو انتخابی نتائج قبول نہیں کئے جائیں گے۔ میاں نواز شریف انہیں بائیکاٹ کیلئے قائل کرنے آئے تو محترمہ نے انہیں انتخاب میں حصہ لینے پر راضی کر لیا تا کہ کنگز پارٹی کا راستہ بند ہو جائے۔ ایک جلوس لیکر وہ ججز کالونی کے گرد لگی ہوئی باڑ تک گئیں اور کہا کہ ہم چیف جسٹس کے

گھر پر ایک بار پھر پاکستان کا جھنڈا لہرائیں گے حالانکہ اس سے پہلے جب چیف جسٹس افتخار محمد چودھری نے این آر او پر حکم امتناعی لگایا تھا۔محترمہ انتہائی سخت الفاظ میں اس فیصلے پر نکتہ چینی کر چکی تھیں۔ وزیر اعظم ہاؤس کی میٹنگ میں جنرل پرویز مشرف نے ''وہ'' یا ''ان'' کی طرف سے جو تین شرائط بتائی تھیں اور وردی اتارنے کا فیصلہ سنایا تھا...... یہ ''ان'' اور ''وہ'' رحم یا رعایت نہیں کرتے۔حکم عدولی کی سزا دینے کیلئے پھانسی کے تختے پر بھی لے جاتے ہیں اور اپنے سفیر اور اعلیٰ افسروں سمیت طیارے کے حادثے میں بھی بھسم کروا دیتے ہیں۔

محترمہ نے حکم عدولی کی اس لئے ان کا ''بلیک وارنٹ'' جاری ہو چکا تھا، 27 دسمبر 2007ء کے جلسہ عام کی فوٹیج دیکھیں۔محترمہ کس دھج سے آئیں اور کس شان سے رخصت ہوئیں۔ تین دن تک پورے ملک میں غدر مچا رہا۔ اسی غدر میں مسلم لیگ (ق) کا کھیل اس طرح اجڑا کہ شہر شہر اور قصبے قصبے میں اس کے پوسٹر اور بینر جلا دیئے گئے۔اس کے امیدواروں کو الیکشن سے زیادہ اپنی جان کی فکر پڑ گئی۔حکمران جماعت ہونے کی وجہ سے مسلم لیگ ق کو جو بالادستی اور فائدہ ملنا چاہیے تھا وہ مٹی میں مل گیا۔ انتخابات ملتوی ہونے کے باوجود حکمران جماعت اپنے پاؤں پر کھڑی نہیں ہو سکی۔ این آر او ایک کھیل تھا، جیتا ہوا کھیل، بینظیر اور پیپلز پارٹی کو بدنام کرنے اور اکثریت حاصل کرنے سے روکنے کا کھیل۔ترک وزیر اعظم طیب اردگان کے مطابق ''بینظیر دنیا کی ایک عظیم رہنما تھیں''۔ انہوں نے کھیل کا پانسہ پلٹنے کیلئے سزائے موت قبول کر لی۔ پہلے ''ق'' لیگ غرق ہوئی پھر جنرل پرویز مشرف کو مواخذے کی تحریک کی ذلت سے بچنے کیلئے استعفیٰ دینا پڑا۔

این آر او کا داغ نہیں دھلا۔

کتنا پکا رنگ ہے اس کالے قانون اور اس کالی سیاست کا۔

■ ■ ■

29 اکتوبر 2009ء

این آر او ایک لمبی کہانی کا عنوان ہے۔ یہ کہانی 17 اگست 1988ء کو سی۔130 کے حادثے میں جنرل ضیاء الحق کے انتقال کے بعد شروع ہوئی۔ اس سے پہلے مرحوم صدر اور آرمی چیف اپنی بنائی ہوئی غیر جماعتی (جو بعد میں جماعتی بن گئی) اسمبلی اور جونیجو حکومت برطرف کر چکے تھے۔ انہوں نے آئین کے کسی خفیہ حصے میں موجود شق کے تحت جو وردی کے صوابدیدی اختیارات سے متعلق تھی نگران حکومت بھی نہیں بنائی تھی۔ حادثے سے پہلے غالباً 12 اگست کو انہوں نے یہ اعلان بھی کیا تھا کہ اگلے 5 انتخابات غیر جماعتی کراؤں گا۔ داغ نے کہا ہے ''سامان سو برس کا ہے، پل کی خبر نہیں'' تقدیر نے 5 الیکشنوں اور 25 سالہ پروگرام 5 دن میں ہی تمام کر دیا۔ بہاولپور سے الگ طیارے میں روانہ ہونے والے وائس آرمی چیف جنرل اسلم بیگ لال کمال میں جلتے ہوئے طیارے کے اوپر سے پرواز کرتے اسلام آباد پہنچے اور چیف کا عہدہ سنبھال لیا۔ چیئرمین سینٹ غلام اسحاق خان قائم مقام صدر بن گئے۔ دونوں نے جماعتی بنیادوں پر عام انتخابات کرانے اور قوم کو جمہوریت کا تحفہ دینے کا فیصلہ کیا۔ پیپلز پارٹی کو قابو میں رکھنے کیلئے اسلامی جمہوری اتحاد بنایا اور مثبت نتائج حاصل کرنے کی وہ حکمت عملی ترتیب دی جو پچھلے دنوں بریگیڈیئر (ر) امتیاز کے ذریعے سامنے آئی اور جس کی تصدیق کرتے ہوئے جنرل (ر) اسلم بیگ صاحب کے علاوہ جنرل (ر) حمید گل نے قومی نظریہ ضرورت بیان کرنے کے علاوہ یہ بھی بتایا ہے کہ وہ نیک نیتی پر مبنی تھی اور مقصد ملک میں دو جماعتی نظام لانا تھا۔ پیپلز پارٹی سب سے بڑی پارٹی کے طور پر جیتی لیکن قومی اسمبلی میں طے شدہ منصوبے کے مطابق سادہ اکثریت سے محروم رہی۔ پنجاب میں میاں نواز شریف نے حکومت بنا لی۔ بینظیر صاحبہ کو اسلام آباد کی 18 میل کی پٹی پر وزیراعظم کے طور پر بیٹھنے کیلئے کچھ ضمانتیں دینی اور شرائط ماننا پڑیں جن میں یہ جبر بھی شامل تھا کہ وہ غلام اسحاق کو صدر منتخب کروائیں گی۔ وہ اسٹیبلشمنٹ کی سفاک اور ناقابل شکست طاقت کے کئی مظاہرے دیکھ چکی تھیں۔ انہیں باپ کی پھانسی، ماں کے سر پر لگنے والی لاٹھیاں، اپنی گرفتاریاں اور جیلیں سب کچھ یاد تھا، اس لئے اسٹیبلشمنٹ سے محاذ آرائی

کے بجائے مفاہمت کی سیاست اختیار کرلی۔

این آر او نے 89-88 میں جنم لیا۔ یہ نام اور شکلیں بدلتا بدلتا اب تقریباً 21 سال کا ہو چکا ہے۔ اس کا پہلا اور اصل نام ''کرپشن'' تھا۔ محترمہ کی پہلی حکومت کے دوران وقفے وقفے سے بدنامی کی نئی نئی آندھیاں اٹھتی رہیں۔ 6 اگست 1990ء کو صدر غلام اسحاق نے قوم سے خطاب کرتے ہوئے چارج شیٹ سنائی اور 58 (ٹو) بی کے تحت حکومت اور اسمبلیاں برطرف کر دیں۔ آصف زرداری کو جیل میں ڈال دیا گیا۔ پیپلز پارٹی کو ہرانے کیلئے آئی ایس آئی کے ذریعے اسلامی جمہوری اتحاد کو فنڈز بھی ملے اور سٹریٹجک مدد بھی۔ پیپلز پارٹی کو اپوزیشن میں بیٹھنا پڑا۔ 6 نومبر 1990ء کو میاں نواز شریف وزیراعظم بنے۔ انہوں نے توقعات کے برعکس صدر غلام اسحاق سمیت اسٹیبلشمنٹ کی بالادستی ماننے اور تابعداری کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ اتنے دیدہ دلیر ثابت ہوئے کہ خلیج کی جنگ کے دوران جنرل اسلم بیگ کے ''مجاہدانہ بیانات'' پر ناراضگی ظاہر کرتے ہوئے انہیں طلب کر کے یہ بھی یاد دلا دیا کہ ''آپ میرے ماتحت ہیں'' حالانکہ یہ وہی ''آپ'' تھے جنہوں نے 88ء اور پھر 90ء میں ملک کو بینظیر بھٹو جیسے ''سکیورٹی رسک'' سے بچایا اور پھر بطور وزیراعظم محترمہ کو سلیوٹ کرنا بھی اپنی ہتک سمجھا۔ بینظیر حکومت برطرف کرانے کے بعد ایک سفارت خانے کی تقریب میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے اس ''سکیورٹی رسک'' کا نام اتنی حقارت سے لیا کہ محترمہ کے مخالف بھی حیران رہ گئے۔ نواز شریف اپوزیشن کو ساتھ ملا کر 58 ٹو بی والا صدارتی اختیار ختم کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے این آر او کے پیدائشی نام ''کرپشن'' کو تبدیل کر کے قومی اسمبلی کی امور خارجہ کمیٹی کی چیئرمین (اپوزیشن لیڈر بینظیر بھٹو) رکھ دیا۔ غلام اسحاق اور میاں نواز شریف کی لڑائی مزید بڑھی تو صدر صاحب نے 58 ٹو بی کی تلوار سے نواز حکومت کو بھی ''کرپشن'' کے کاری وار کر کے قتل کر دیا۔ غلام اسحاق خان نے میر بلخ شیر مزاری کو نگران وزیراعظم بنایا اور پھر بینظیر حکومت کی برطرفی کے وقت قوم سے خطاب میں اپنی زبان سے نکلے ہوئے الزامات کو یاد کیے بغیر ''کرپشن'' (جو حکومت ٹوٹنے کے بعد اپنے پرانے نام پر

واپس آ چکی تھی) کو نیا نام بخش دیا۔ یہ نام تھا ''وفاقی وزیر ماحولیات و سرمایہ کاری (آصف علی زرداری)''۔ اس طرح 90ء کی حکومت کے دوران بینظیر اور آصف زرداری پر لگائے جانے والے کرپشن کے الزامات کو پہلے نواز شریف اور پھر غلام اسحاق نے جھوٹا تسلیم کیا۔

■ ■ ■

30 اکتوبر 2009ء

بھٹو خاندان کا المیہ یہ ہے کہ کلیدی فیصلے کرتے وقت بھی انہیں حضرت علیؓ کا یہ قول یاد نہیں رہتا ''ڈرو اس شخص کے شر سے جس پر تم نے احسان کیا ہو''۔ 1970ء کے طوفان میں بھٹو کے نام پر منتخب ہونے والوں کی اکثریت ایسی تھی جنہوں نے اقتدار کی طرف جانے والی سڑکوں یا راستوں کو کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا۔ انہیں بڑے بڑے رتبے اور عہدے ملے۔ جب برا وقت آیا اور بھٹو صاحب پھانسی کی کوٹھڑی میں بے بس پڑے تھے، پارٹی کے کچھ نامور، بہت ہی قابل اعتماد اور وفادار لیڈر ایسے بھی تھے جنہوں نے جنرل ضیاء الحق کے سامنے یہ بھی کہہ دیا کہ ''جب تک ''یہ شخص'' زندہ ہے، پیپلز پارٹی ٹوٹے گی نہ ہم آپ کا ساتھ دے سکیں گے''۔ جدوجہد اور اقتدار کے پہلے دور میں محترمہ بینظیر یہ بھی جان چکی تھیں کہ سیاست میں ''وفاداری'' یا ''احسان'' جیسے الفاظ اس وقت بے معنی ہو جاتے ہیں جب اقتدار منقسم اور ایک سے زیادہ حصوں میں برابر یا خود مختار ہو۔ دوسرے اقتدار میں صدر بھی محترمہ کا ''اپنا'' تھا اور چیف جسٹس (سید سجاد علی شاہ) بھی۔ حقیقت یہ ہے کہ سیاست اور اقتدار میں اپنے سوا کوئی اپنا نہیں ہوتا۔ پیپلز پارٹی کا دوسرا دور اقتدار 19 اکتوبر 1993ء کو شروع ہوا۔ میاں نواز شریف الیکشن ہار کر اپوزیشن میں بیٹھ گئے تھے لیکن پتے پھینکنے کے بجائے کھیل جاری رکھنے اور جیتنے کا عزم کئے ہوئے تھے۔ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ ان کا ووٹ بینک نہ صرف قائم ہے بلکہ بڑھ رہا ہے اور پیپلز پارٹی کو ناپسند کرنے والی اسٹیبلشمنٹ نے بھی اپنی شکست نہیں مانی۔ میاں صاحب نے پہلا حملہ پیپلز پارٹی

کی اس طاقت پر کیا جو اس نے فاروق لغاری صاحب کو ایوان صدر میں بٹھا کر حاصل کی تھی۔ انہوں نے مہران بنک سکینڈل اٹھایا اور ''مسٹر کلین'' کو ڈیرہ غازی خان تک رسوا کر دیا۔ پیپلز پارٹی اور اس کی حکومت لغاری صاحب کیلئے کچھ کر سکتی تھی نہ کر سکی۔ صدر صاحب نے شاید اپنے دل میں پہلی گانٹھ اس واقعہ کی وجہ سے باندھی، پھر مزید گانٹھیں بندھتی چلی گئیں جو ذاتی بھی تھیں اور خاندانی بھی۔ ججوں کی تقرریوں کے تنازعہ پر چیف جسٹس سجاد علی شاہ کی ناراضگی اتنی بڑھی کہ دشمنی میں تبدیل ہو گئی۔ انہوں نے صدر لغاری کے ساتھ اتحاد کر لیا۔ اس اثنا میں میاں نواز شریف حکومت پر فیصلہ کن حملہ کر چکے تھے۔ انہوں نے محترمہ بینظیر اور آصف زرداری کا پرانا نام ''کرپشن'' نہ صرف بحال کر دیا بلکہ ''شاہی جوڑے'' (یہ خطاب شاید پہلے دور میں ہی ایجاد ہو گیا تھا) کی شناخت بنا دیا...... اس کے ساتھ ساتھ وہ صدر کے ان زخموں کیلئے بھی مرہم فراہم کرتے رہے جو پہلے انہوں نے خود لگائے تھے اور پھر ''شاہی جوڑے'' کی ''گستاخیوں'' کے سبب لگ رہے تھے۔ لغاری صاحب نے پرانے زخم بھلا دیئے اور نئے زخم مندمل کرنے کیلئے میاں نواز شریف کو ایوان صدر آنے کی دعوت دی۔ یہ ملاقات کھیل ختم ہونے کا سگنل تھا۔ حکومت ''آج گئی یا کل گئی'' یعنی نزع کی کیفیت میں تھی کہ کراچی میں مرتضٰی بھٹو کو قتل کر دیا گیا۔ یہ اتفاق تھا یا بھٹوز سے مکمل نجات کی کسی حکمت عملی کا حصہ، کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ 5 نومبر 1996ء کو صدر لغاری نے 58ٹو بی کا اختیار استعمال کرتے ہوئے وفاقی حکومت، قومی اسمبلی، چاروں صوبائی حکومتیں اور صوبائی اسمبلیاں برطرف کر دیں۔ قوم سے اپنے خطاب میں انہوں نے ''کرپشن'' کے الزامات کی اتنی بوچھاڑ کی کہ غلام اسحاق خان کو بھی مات کر دیا۔ محترمہ کے بیانات کے جواب میں ایوان صدر سے جاری ہونے والے بیانات کا لب ولہجہ انتہائی تلخ بلکہ نازیبا ہوتا تھا۔ حکومت کی برطرفی کے خلاف سپریم کورٹ میں پٹیشن دائر ہوئی جو رجسٹرار نے یہ اعتراض لگا کر واپس کر دی کہ انداز بیان صدر صاحب کے شایان شان نہیں۔ تاہم عدالت میں ترمیم شدہ پٹیشن کا وہ صدارتی جواب قبول کر لیا گیا جس میں توہین آمیز ذاتی حملے بھی شامل تھے۔ یہ اقتدار کی جنگوں کی تاریخ کا ایک اور باب تھا جس میں

ماضی کے رشتے اور تعلقات اتنی بیدردی سے ذبح کیے گئے کہ اس پرانی کہاوت سے بھی یقین اٹھ گیا کہ "قتل کرنے والا اپنا ہو تو از راہِ مروت لاش پھینکنے کیلئے جگہ ایسی چنتا ہے جہاں چھاؤں ہو"۔ فاروق لغاری نے بھٹو کی پھانسی کے بعد مسلسل محترمہ بینظیر کا ساتھ دیا تھا۔ پیپلز پارٹی کے پہلے دور اقتدار میں نواز شریف حکومت کو چیلنج کرنے کیلئے وہ پنجاب اسمبلی میں قائد حزب اختلاف بنے تھے۔ بات بنتی نظر نہ آئی تو وفاقی وزیر خزانہ بن گئے۔ کرپشن کے الزامات کی پہلی دہائی بینظیر حکومت کے اسی دور میں مچی تھی لیکن تمام الزامات رد کر کے لغاری صاحب نواز شریف صاحب کی پہلی حکومت کے خلاف جدوجہد میں شامل رہے۔ دوسرے دور میں جب وہ صدارتی امیدوار بنائے گئے۔ انہیں زیادہ سے زیادہ ووٹ دلوانے کیلئے آصف زرداری اتنے سرگرم تھے کہ اس طرح کی خبریں بھی چھپتی رہیں کہ وہ ایک ایک ووٹ کیلئے ایک ایک بریف کیس اٹھائے پھر رہے ہیں۔ 14 نومبر 1993 کو وہ صدر منتخب ہوئے۔ 10 اکتوبر 1996ء کو محترمہ بینظیر بھٹو کی حکومت اور اسمبلیاں برطرف کیں۔ یہ سوال ابھی تک جواب طلب ہے کہ انہیں کب یہ پتہ چلا کہ محترمہ اور آصف زرداری کرپشن میں ملوث ہیں پھر انہوں نے کتنے دن یا کتنے مہینے انتظار کیا کہ وہ سدھر جائیں۔ صدر اور چیف جسٹس پیپلز پارٹی کو بدترین شکست دلوانے کی منصوبہ بندی میں شامل تھے۔ لغاری صاحب نگران حکومتوں کے ذریعے الیکشن کے "مال غنیمت" میں مناسب حصے کی توقع بھی رکھتے تھے لیکن میاں صاحب نے بازی ہی پلٹ دی۔ وہ دو تہائی اکثریت لیکر آئے اور حکومت بنالی۔

سینیٹر سیف الرحمٰن کو احتساب پر لگا دیا۔ وہ مقدمے گھڑنے کے ساتھ آصف زرداری کی جان لینے پر بھی تلے ہوئے تھے۔ سیف الرحمٰن کے جنون کا ایک قصہ بیان کرتے ہوئے خود میاں شہباز شریف یہ انکشاف کر چکے ہیں کہ وزیراعظم میاں نواز شریف کو بروقت آگاہ کر کے وہ ذاتی طور پر مداخلت نہ کرتے تو سیف الرحمٰن نے آصف زرداری کو لاہور ایئرپورٹ پر قتل کرانے کا پورا انتظام کر رکھا تھا جب وہ کراچی سے لاہور لائے جا رہے تھے۔

پیپلز پارٹی حکومت کی برطرفی کے بعد صدر لغاری اور وزیراعظم نواز شریف نے اتفاق

رائے سے شاہی جوڑے کو اُس کا پرانا نام ''کرپشن'' واپس دیدیا۔ ملک کے اندر اور باہر درجن سے زیادہ مقدمات بنے۔ بینظیر صاحبہ سزائے قید کے ایک ''طے شدہ فیصلے'' (جس کی تصدیق بعد میں جج اور سیف الرحمٰن کی ٹیپ شدہ گفتگو سے بھی ہوئی) سے ایک دن پہلے ملک سے باہر چلی گئیں۔ نواز شریف صاحب نے ''مروت'' یا ''لحاظ'' وغیرہ کا خطرہ مول لینے کے بجائے صدر اور چیف جسٹس دونوں کو ٹھکانے لگایا اور پھر عوامی طاقت کی مقبولیت کے زعم میں فوج سے ''بے تکلفی'' شروع کر دی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ 12 اکتوبر 1999ء کو جنرل پرویز مشرف نے حکومت پر قبضہ کر لیا۔ نواز شریف صاحب کو قید میں ڈالا لیکن بعد میں سزائیں معاف کر کے خاندان سمیت جلا وطن کر دیا گیا۔ اس معاہدے یا انتظام کو این آر او جیسے کسی ''رسوائے زمانہ'' نام سے نہیں پکارا جاتا۔ اسے سعودی عرب والوں کی مہربانی کہہ لیں یا جنرل پرویز مشرف کا ''اعتراف گناہ'' لیکن یہ پرویز مشرف کی پہلی سیاسی مفاہمت ضرور تھی۔ جلاوطنی کے وقت اور بعد میں بلکہ آج بھی میں شریف خاندان کے اس فیصلے کو درست کہتا اور سمجھتا ہوں۔ انہوں نے جدہ میں سیاسی مورچہ بنا کر پرویز مشرف پر تیر اندازی جاری رکھی اور اپنا سیاسی وجود عوام کی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیا۔ پرویز مشرف بار بار یہ فیصلہ سناتے رہے کہ بینظیر اور نواز شریف دونوں کو وطن اور سیاست میں واپس نہیں آنے دیں گے۔ لیکن دونوں کو یقین تھا کہ انہیں روکا نہیں جا سکے گا۔

2002ء کے انتخابات میں پیپلز پارٹی دوسری بڑی پارٹی بن کر جیتی۔ اس کی بھٹو قیادت کا نام اس کے باوجود ''کرپشن'' ہی رہا۔ مشرف صاحب نے بریت کا یہ عوامی فیصلہ نہیں مانا۔ دھاندلی کے باوجود ق لیگ سادہ اکثریت بھی حاصل نہیں کر پائی تھی۔ جنرل پرویز مشرف مخدوم امین فہیم کو وزیراعظم بنا کر پیپلز پارٹی اور ق لیگ کی مخلوط حکومت بنانے کیلئے بے قرار تھے۔ ان کے نمائندے جیل میں آصف زرداری سے ملتے اور مقدمات کے خاتمے سمیت ہر قسم کی پیشکشیں کرتے رہے۔ شرط یہ تھی کہ بینظیر صاحبہ مشرف کی مرضی کے بغیر واپس نہ آئیں۔ بینظیر اور زرداری صاحب کو مقدمات کا خوف یا اپنی بے گناہی پر کوئی شک ہوتا تو اس

سنہری موقع سے فائدہ اٹھانے سے انکار نہ کرتے۔ بہر حال ''قیدی'' اور ''جلاوطن'' دونوں نے کسی بھی رعایت کے عوض اپنی پارٹی کو مخلوط حکومت میں شمولیت کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ مشرف صاحب نے پیپلز پارٹی کے مطلوبہ ارکان توڑ کر مخلوط حکومت بنوالی۔ اس عمل کا نام ''ضمیر کی آواز'' رکھا گیا۔

14 مئی 2006ء کو لندن میں ایک تاریخی واقعہ ہوا۔ محترمہ بینظیر بھٹو اور میاں نواز شریف میں مفاہمت ہوگئی۔ دونوں نے ایک دستاویز پر دستخط کئے۔ میاں صاحب مذاکرات کے مختلف مرحلوں کے دوران کرپشن کے ایک بڑے ''ملزم'' رحمان ملک کے گھر بھی گئے .....سیاسی تاریخ کے اس موڑ پر ''کرپشن'' کو ایک نیا اور متفقہ سیاسی نام دیا گیا جسے ''میثاق جمہوریت'' کہا جاتا ہے۔

واہ! کیا خوبصورت نام تھا، اس نئی سیاسی مفاہمت اور مصلحت کا؟

■ ■ ■

2 نومبر 2009ء

''میثاق جمہوریت'' کو دو بڑی سیاسی پارٹیوں کے لیڈروں بینظیر اور نواز شریف کے درمیان ''این آر او'' بھی کہا جا سکتا ہے۔ این آر او انگریزی کے تین حرفوں پر مشتمل جنرل پرویز مشرف کا جاری کردہ ایک آرڈیننس تھا لیکن اب ایک ایسی اصطلاح بن چکا ہے جس کے کئی معنی ہیں۔ مفاہمت، مصلحت، معاہدہ، سودا، اقتدار میں آنے کا ذریعہ مجبوریوں اور مصیبتوں سے نکلنے کا راستہ، فوجی اقتدار سے چھٹکارا پانے کی سیاسی چال، کسی اصولی موقف سے دستبرداری، وغیرہ وغیرہ۔ آجکل اس کا واحد مطلب کرپشن کے وہ مقدمات ہیں جو میاں نواز شریف کے دوسرے دور میں محترمہ بینظیر، آصف زرداری اور ان کے ساتھیوں کے خلاف بنائے گئے اور جنہیں بعد میں جنرل پرویز مشرف نے پیپلز پارٹی کی بھٹو قیادت کو سیاست سے نکالنے کے حربے کے طور پر اپنا ہتھیار

بنائے رکھا۔

میثاق جمہوریت میں فوجی آمریت سے براہ راست یا بالواسطہ رابطے ممنوع قرار دیئے گئے تھے۔ پہلا اختلاف اسی نکتے پر ہوا۔ میاں صاحب سمجھتے تھے کہ آرمی چیف کو عوامی طاقت سے شکست دی جا سکتی ہے۔ بینظیر صاحبہ نے ماضی کے المناک تجربات سے یہ سبق سیکھا تھا کہ آرمی چیف کا مطلب ایک شخص نہیں بلکہ وہ ایک ڈسپلنڈ اور طاقتور فورس کا نام ہے جو اپنے سربراہ کے ہر حکم کو جائز یا ناجائز کی بحث میں پڑے بغیر حرف آخر سمجھتی ہے۔ انہوں نے پرویز مشرف کی وردی کو ٹارگٹ بنایا۔ مشرف کے سرپرست امریکہ کو (جو اپنے مفادات کو مقدم رکھتا ہے) سول جمہوریت کے فوائد کا قائل کیا اور دبئی ملاقات میں مشرف صاحب کو اپنے موقف کی منطق سمجھائی۔ نواز شریف کو یہ کھیل پسند نہیں تھا۔ وہ ناراضگی کا اظہار کرتے رہے لیکن ''میثاق جمہوریت'' منسوخ نہیں کیا۔

بینظیر اور نواز شریف کے ''معاہدہ لندن'' سے یہ مطلب بھی اخذ کیا گیا کہ دونوں بڑی پارٹیوں کے لیڈروں نے اپنے اپنے دور اقتدار کے گلے شکوے، تلخیاں اور دشمنیاں ماضی میں دفن کر دی ہیں اور طے کر لیا ہے کہ آئندہ سیاست اور اقتدار میں مفاہمت اور رواداری کو مقدم رکھا جائے گا۔ سوال یہ ہے کہ کرپشن کے جن مقدمات کو جواز بنا کر آجکل این آر او کو کالا قانون اور منظور ہونے کی صورت میں ملک اور پارلیمنٹ کیلئے بدنامی کا انمٹ داغ قرار دیا جا رہا ہے میثاق جمہوریت کے وقت وہ کیا ہوئے یا کہاں گئے؟ انہیں ڈھونڈنا ضروری ہو تو سہیل وڑائچ کی کتاب ''غدار کون'' میں شامل میاں نواز شریف کے انٹرویو کا یہ اقتباس حاضر ہے۔

[''کیا آپ کا احتساب ٹھیک تھا؟ میں نے لوہا گرم دیکھ کر ایک اور سوال پوچھ لیا۔ نواز شریف نے صاف گوئی سے کہا احتساب کا طریق کار غلط تھا، ہمیں اس حوالے سے اکسایا گیا۔ فوج اور آئی ایس آئی کا ہم پر دباؤ تھا۔ جان بوجھ کر ہم سے بینظیر اور اپوزیشن کے خلاف ایسے اقدامات کروائے گئے تا کہ سیاست دانوں کا اعتبار ختم ہو جائے۔'']

تیسری مرتبہ وزیراعظم بننے کی شرط پر پابندی ختم کرنے کے بجائے مقدمات کے

خاتمے والی شرط مان کر ''کرپشن'' کا نام بدل کر این آر او رکھنا محترمہ بینظیر کے ''کھیل'' یا ''چال'' کے مقابلے میں مسلم لیگ (ق) کے لیڈروں کی شاندار ''چال'' تھی جس کا نتیجہ بیان کرتے ہوئے چودھری شجاعت حسین صاحب نے اعلان کر دیا تھا کہ ہم نے کھیل جیت لیا ہے۔ این آر او جاری ہوتے ہی ''کالینکروں'' ''تانگہ'' اور ''ٹینک'' پارٹیوں نے مل کر آسمان سر پر اٹھالیا۔ بدنامی کا ایسا ہی ایک طوفان بینظیر صاحبہ کی دوسری حکومت توڑ کر فاروق لغاری صاحب نے اٹھایا تھا اور مثبت نتائج کے انتظامات کر کے پیپلز پارٹی کے ووٹ بنک کو غارت کر کے رکھ دیا تھا۔ پھر سینیٹر سیف الرحمٰن اور جنرل پرویز مشرف نے یہی طوفان مسلسل اٹھائے رکھا۔ اس کے باوجود 2002ء کے دھاندلی زدہ انتخابات میں عوام کی اکثریت نے یہ فیصلہ سنا دیا کہ وہ محترمہ اور زرداری پر کرپشن کے الزامات کی صداقت پر یقین نہیں رکھتے۔

این آر او کے بعد جنرل پرویز مشرف ''چت بھی اپنی پٹ بھی اپنی'' کی پوزیشن میں آ گئے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ امریکہ ضامن ہے اس لئے بینظیر صاحبہ زبانی وعدوں کے بندھن توڑنے کی جرات نہیں کر سکیں گی اور مسلم لیگ ''ق'' تو تھی ہی ان کی اپنی۔ عام انتخابات کے طے شدہ مثبت نتائج میں کسی گڑبڑ کا امکان ختم کرنے کیلئے انہوں نے بینظیر صاحبہ کو خطرات سے ڈرا کر روکنا اور ضامنوں کے ذریعے اپنا مطالبہ منوانا چاہا۔ وہ نہیں مانیں۔ ان کا طیارہ لینڈ کرنے سے پہلے پیپلز پارٹی کے لاکھوں ''کارکن'' اور حامی کراچی ائرپورٹ سے مزار قائداعظم تک این آر او نامی بدنامی کے پرزے ہوا میں اڑا چکے تھے۔ ضامن دیکھتے رہ گئے۔ پھر زبانی وعدے ایک ایک کر کے مٹی میں ملتے گئے۔ مسلم لیگ (ق) کے لیڈر امیر مقام کہتے ہیں کہ بینظیر صاحبہ نے پرویز مشرف صاحب کو پانچ سال کیلئے صدر تسلیم کر کے خود وزیراعظم بننے کا ''وعدہ'' کیا تھا۔ دوسرے لفظوں میں انہوں نے مسلم لیگ (ق) کے ساتھ مخلوط حکومت بنانی تھی۔ لیکن ہوا کیا محترمہ نے اس ''وعدے'' کا حشر کر دیا۔ میاں نواز شریف اے پی ڈی ایم کے تحت عام انتخابات کے بائیکاٹ کا اعلان کر چکے تھے۔ وہ این آر او زدہ بینظیر صاحبہ کو بائیکاٹ پر راضی کرنے کیلئے اسلام آباد آئے لیکن الیکشن لڑنے پر قائل ہو کر واپس چلے گئے۔

اپنے اردگرد جمع ''تانگہ'' اور ''ٹینک'' پارٹیوں کا دباؤ مسترد کر دیا۔ جن میں سے کچھ ان کی مقبولیت اور مروت سے فائدہ اٹھا کر سابق پارلیمنٹ میں آئی تھیں اور آئین میں اس ترمیم کی بھی منظوری دے دی تھی کہ تیسری مرتبہ وزیراعظم بننے پر پابندی ہو گی۔ ٹارگٹ کون تھا؟ بینظیر بھٹو اور میاں نواز شریف۔ بینظیر نے ہر قیمت پر وزیراعظم بننا ہوتا اور ''سوئس دولت'' (جس کا نام میثاق جمہوریت کے بعد این آر او رکھا گیا تھا) ہی ان کا نصب العین ہوتی تو واپس آ کر زندگی کا داؤ لگانے کی کیا ضرورت تھی۔

سانحہ لیاقت باغ کے بعد میاں نواز شریف اپنا شیڈول بدل کر ہسپتال پہنچے۔ وہ انتہائی غمزدہ تھے۔ ان کی آنکھوں سے آنسو بھی بہے، جذبات سے مغلوب ہو کر انہوں نے یہ بھی کہہ دیا کہ ''میں بینظیر کا مشن پورا کرونگا'' (کچھ لوگ اس جملے کو طعنہ بنا کر پیش کرتے ہیں لیکن میں اسے انسانیت کا اعلیٰ جذبہ اور ایک بڑے آدمی کی وسیع القلبی سمجھتا ہوں) یہاں پر میں میاں صاحب سے یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ کسی دن اپنے کمرے میں اکیلے بیٹھ کر اپنے آپ سے دو سوال کریں۔ نمبر 1، محترمہ بینظیر این آر او کے ذریعے راستہ نکال کر واپس نہ آتیں اور ایک دن پہلے ملنے والی وارننگ (جسے نظر انداز کرنا یقینی موت کو گلے لگانے کے مترادف تھا) کے باوجود راولپنڈی کے لیاقت باغ میں آ کر شہید نہ ہوتیں تو کیا عام انتخابات کے بعد سیاسی سیٹ اپ اور پارلیمنٹ کی شکل وصورت یہی ہوتی جو اس وقت موجود ہے۔ نمبر 2 قارون کے خزانے سمیت کتنی دولت، طاقت اور اقتدار سمیت وہ کونسی خواہش اتنی بڑی اور تکمیل کے حوالے سے اتنی ناگزیر ہوتی ہے جس کیلئے بینظیر جیسی خاتون بھی اپنی زندگی داؤ پر لگانے کیلئے تیار ہو جائے اور ایک خودکش دھماکے سے بچنے کے بعد اس سیاسی سفر پر نکل پڑے جس میں کوئی بھی جلسہ گاہ آخری قتل گاہ بن سکتی ہو۔

بھٹو صاحب نے پھانسی لگنے سے پہلے اپنا سیاسی ورثہ محترمہ بینظیر کے سپرد کیا تھا۔ انہوں نے اس ورثے کو بچاتے ہوئے اپنی جان قربان کر دی۔ نواز شریف صاحب نے اپنا سیاسی اثاثہ خود بنایا ہے۔ انہیں خطرات کا علم ہے لیکن کیا وہ اپنے سیاسی اثاثے کو ان خطرات پر

قربان کر سکتے ہیں؟ یہی مسئلہ محترمہ کے اس این آر او زدہ جانشین آصف زرداری کا ہے۔ جسے چار قبریں دیکھ کر بھی یہ خوف نہیں آتا کہ یہ ورثہ قتلوں کے ایک سلسلے کے ساتھ منسلک ہے۔

این آر او کے اسی جانشین کے مشورے پر میاں نواز شریف نے بائیکاٹ کا دوسرا فیصلہ واپس لیا تھا۔ اسی کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر اعلان فتح کیا گیا۔ مخلوط حکومت بنائی گئی، اسی کے ساتھ مل کر مشرف سے استعفیٰ لیا گیا۔ اسی این آر او زدہ پیپلز پارٹی کی قیادت کو دوسروں سے بڑا مینڈیٹ ملا۔ اسی کا وزیراعظم منتخب ہوا۔ یہی این آر او والا چاروں صوبائی اسمبلیوں، قومی اسمبلی اور سینٹ سے 481 ووٹ لیکر صدر منتخب ہوا۔ اتنے بڑے بڑے واقعات گزر گئے۔ کرپشن یاد آئی نہ این آر او۔ این آر او نہ آتا تو یہ پارلیمنٹ یوں نہ ہوتی۔ وزیراعظم کا نام بھی سید یوسف رضا گیلانی نہ ہوتا۔

کاش گیلانی صاحب این آر او پر پتھر اٹھانے والے ارکان پارلیمنٹ سے یہ کہہ سکیں کہ پلیز مارنے سے پہلے اپنے پتھر پر چپکی ہوئی سیاہی تو صاف کر لو، وہ سیاہی جو جنرل پرویز مشرف سیاست اور سیاستدانوں پر پھینکتے رہے۔ جو کبھی سودا، کبھی معاہدہ اور کبھی مہربانی اور کبھی کسی اور نام سے پکاری گئی لیکن ایسا کالا قانون نہیں کہلا سکی جو ہماری پاکیزہ اور شفاف سیاست اور پارلیمنٹ کیلئے داغ بن سکتا ہو۔

■ ■ ■

نیا کھیل

19 اکتوبر 2010ء

جنرل (ر) پرویز مشرف نے نئے کھیل میں اپنا ''پہلا راؤنڈ'' خوب کھیلا۔ اب ان کی سیاست چلے نہ چلے، لیڈری چلتی رہے گی۔ وہ خبروں میں رہنے اور شہ سرخیوں میں آنے کا فن جانتے ہیں۔ ''بریکنگ نیوز'' کے معاملے میں بھی ہاٹ فیورٹ ہیں۔ ٹاک شوز کا مقبول موضوع تو پہلے ہی بن چکے ہیں، آگے چل کر'' آرہے ہیں، کب آرہے ہیں، نہیں آئیں گے'' کی بحث کا حصہ بنے رہیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ معتبر کمپنیاں ان کی مقبولیت کے سروے بھی کروائیں اور ایک آدھ کمپنی انہیں پہلے نمبر پر بھی لے آئے۔

جب وہ اقتدار پر قابض ہوئے تو مجھے جنرل یحییٰ خان کا ڈی لکس ایڈیشن لگتے تھے۔ پھر میرا خیال تھا کہ وہ ایک کھرے اور روشن خیال جنرل ہیں اور ملک کو ضیاء الحق کے ان اندھیروں سے نجات دلا سکتے ہیں جو مرحوم نے اسلام کے نام پر تخلیق کیے اور جن کا عنوان منافقت تھا۔ بہرحال اس کے برعکس انہوں نے اقتدار کی سیاست کیلئے ضیاء الحق کے نظریاتی فرقے کو اتحادی بنایا اور پھر 9/11 کے بعد امریکہ کا ہر وہ حکم بھی مان لیا جسے ''سوری'' کہہ کر ٹالا یا مسترد کیا جا سکتا تھا یا جنرل اشفاق پرویز کیانی کی طرح چین سموکنگ کے دھوئیں میں اڑایا جا سکتا تھا۔

صدارت سے مستعفی ہو کر ملک چھوڑنے تک میرے نزدیک پرویز مشرف ویسے ہی ایک غاصب جرنیل تھے جو اپنے پیشروؤں کی طرح سازشوں سے جمہوری حکومتوں پر قبضے

کرتے رہے اور بالآخر جوابی سازشوں سے شکست کھا کر بھولی ہوئی کہانیاں بن گئے۔ جنرل (ر) پرویز مشرف کی رخصتی غیر روایتی طریقے سے ہی ہوئی، وہ نیا سیٹ اپ بنا کر اقتدار میں رہنا چاہتے تھے لیکن اُن کا اصل ایجنڈا ناکام ہو گیا، میرا قیاس ہے کہ انہوں نے ایک متبادل ایجنڈا پہلے سے تیار کر رکھا تھا جس کا عنوان ''نئی سیاست اور نئی قیادت'' تھا۔ وہ فوجی آمر تھے، 3 سالہ آمریت کے بعد 5 سال تک ایک زوردار جمہوریت چلائی۔ کہا جاتا ہے کہ وہ بہت مالدار ہیں لیکن آخر تک کرپشن کے الزامات سے بچے رہے۔ انہوں نے بے شمار خون بہایا لیکن خون کا ایک چھینٹا بھی براہ راست اپنے دامن پر نہیں لگنے دیا۔ سیاست اور جمہوریت میں نئی برائیاں پیدا کیں لیکن انہیں گالی نہیں بننے دیا تاہم اسے ننگوں کا وی آئی پی حمام بنا دیا۔ آج کی جمہوریت میں شاید ہی کوئی سیاسی پارٹی یا سیاستدان ایسا ہو جس کے ماتھے یا پیٹھ پر پرویز مشرف نے کوئی نہ کوئی داغ نہ لگایا ہو۔ آخر میں وہ امریکی ایجنڈے کے مطابق وردی اتار کر پیپلز پارٹی کو اپنے ساتھ اقتدار میں شریک کرنا چاہتے تھے۔ لیکن نیک نیتی سے نہیں۔ محترمہ بینظیر اور آصف علی زرداری کے خلاف مقدمات ختم کرنے کیلئے وہ ویسا ہی کوئی شفاف طریق کار بھی استعمال کر سکتے تھے جو 2002ء کے انتخابات کے بعد پیپلز پارٹی کو چھوڑ کر ''پیٹریاٹ'' بننے والوں کیلئے بروئے کار لایا گیا تھا۔ لیکن انہوں نے محترمہ اور زرداری کے خلاف درجن بھر سیاسی مقدمات کو قتل، ریپ، اغوا جیسے جرائم کے سینکڑوں مقدمات کے ساتھ ایک کنٹینر میں جمع کر کے پیپلز پارٹی کے سر پر لاد دیا۔

محترمہ بینظیر بھٹو بدنام زمانہ این آر او کا بوجھ اٹھا کر واپس آئیں۔ مشرف نے بعد میں میاں نواز شریف کو جلاوطنی کے معاہدے کی مدت پوری کئے بغیر واپس آنے دیا۔ کیوں؟ میرا خیال ہے کہ اس سوال کا تعلق پرویز مشرف کے متبادل ایجنڈے سے ہے۔ انہیں یقین تھا کہ پیپلز پارٹی اور نواز شریف میں پرانی سیاسی دشمنیاں زندہ ہوں گی۔ 1988ء والا سیاسی فساد دوبارہ برپا ہو گا ان کی 58ٹو بی والی صدارت قائم رہے گی اور اس سیاسی سرکس میں بھی وہی ''رنگ'' ماسٹر ہونگے لیکن اپنے منصوبوں کے برعکس انہیں صدارت سے مستعفی ہونا پڑا۔ ممکن

ہے ملک چھوڑ کر جاتے وقت انہوں نے دوسرا خواب یہ دیکھا ہو کہ پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ (ن) زیادہ دیر تک ایک دوسرے کو برداشت نہیں کر سکیں گی۔حکومتیں اپنی عمر پوری کرنے سے پہلے قتل ہوں گی۔ان کا گلا سنگین سے نہ کٹا تو سر ہتھوڑے سے چکنا چور ہوگا۔ان کے اندازے درست ثابت نہیں ہوئے لیکن امیدیں قائم ہیں۔

اسے اتفاق کہہ لیں یا طے شدہ حکمت عملی ، جنرل (ر) پرویز مشرف نے اپنے نئے کھیل میں دو عوامی طاقتوں کو ٹارگٹ بنایا ہے جنہیں راستے سے ہٹائے بغیر وہ سیاست یا اقتدار میں واپس نہیں آ سکتے۔ پیپلز پارٹی اس لئے ان کی پہلی ترجیح نہیں کہ اسے نفرت کی علامت بنانے کی خواہش 44 سال کے عرصے میں بھی کامیاب نہیں ہوئی۔ اس کا ''ووٹ بنک'' الزام پروف ہے۔1988ء سے لیکر آج تک مسلم لیگ (ن) نے کرپشن ، بیڈ گورننس اور این آر او کی قوالی کر کر کے پیپلز پارٹی کو مجسم بہتان بنا رکھا ہے۔ جبکہ پیپلز پارٹی مفاہمت کی سیاست کے نام پر ابھی تک صبر کا مظاہرہ کر رہی ہے۔وہ ''بلیم گیم'' میں نہیں پڑی۔پچھلے دنوں لاہور کے ضمنی انتخابات میں عمران خان کی چند تقریروں نے مسلم لیگ (ن) کے کچھ بھرم توڑے تھے تب بھی ''ن'' لیگ والوں کو یہ احساس نہیں ہوا کہ اس کھیل میں کوئی نہیں جیتے گا، سب ہار جائیں گے۔

میرا خیال ہے کہ جنرل (ر) مشرف نے اب ''ن لیگ'' کو ٹارگٹ بنانے کا فیصلہ کیا ہے۔میاں نواز شریف کے بارے میں چند نازیبا جملے کہہ کر انہوں نے اُس ڈرامے کا ٹریلر دکھایا ہے جو وہ قومی اور عالمی سطح پر نمائش کیلئے پیش کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ہمارے سیاستدان ہوں یا میڈیا کا ایک مخصوص حصہ، یہ سب گوبلز کی اس تھیوری کے پیروکار ہیں کہ ''جھوٹ اتنا اور اتنی بار بولو کہ سچ بن جائے''۔کرپشن ایک ایسا الزام ہے جو دستاویزی یا دوسرے مطلوبہ ثبوتوں کے بغیر کسی پر بھی لگایا جا سکتا ہے۔ پہلا پتھر مارنے کیلئے یہ شرط بھی پوری نہیں کرنی پڑتی کہ پتھر مارنے والے نے خود کوئی گناہ نہ کیا ہو۔احتساب اور کرپشن دور حاضر کا ایک مقبول نعرہ ہے۔الزام لگانے والوں کو یہ حق حاصل ہے کہ خود کو دیانت کی مثال بنا کر پیش

کریں اور اپنے سیاسی مخالفوں کو کرپشن کے الزامات میں ڈبوتے رہیں۔۔

اس ملک کی عمر صرف 64سال ہے۔ایوب خان کے دور میں یہاں بیس گھرانے دولتمند تھے۔ اب لاکھوں ہیں۔ ان 64 سالوں میں کچھ لوگوں نے چھوٹے بڑے کاروبار کیئے۔ کچھ نوکریاں کرتے تھے۔ کچھ زمیندار تھے۔ کچھ کارخانہ دار تھے۔ کچھ سیاست کو عبادت اور حکمرانی کو قومی خدمت سمجھتے تھے۔کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ دیانت کا وہ کونسا فارمولا ہے جس کی مدد سے انہوں نے دولت کے انبار لگا لیئے۔کرپشن ہمارے ملک کی سب سے طاقتور حقیقت ہے اور اُسے برا کہنا اس لیئے ہمارا حق ہے کہ ہم دیانت دار اور امانت دار ہیں۔ ہمارے ملک میں لوگ بھوک سے تنگ آ کر خودکشیاں کر لیتے ہیں۔ ہم بیواؤں اور یتیموں کی جائیدادوں پر قبضے کرتے اور کرواتے ہیں۔ ہم کمزور کا حق چھین لیتے ہیں۔ ہم جج ہیں۔ ہم پولیس ہیں، کوئی ہمیں چیلنج نہیں کر سکتا۔ اٹھارہ   بیس کروڑ بھیڑوں کے درمیان ہم تین چار لاکھ بھیڑیئے انصاف، غربت، قانون، حق، دیانت اور امانت وغیرہ جیسے الفاظ صرف اس لیئے بولتے ہیں کہ حقیروں کو ان کی اوقات کے ساتھ ہماری طاقت یاد رہے۔

میں اصل موضوع سے دور ہٹ گیا ہوں۔ بات ہو رہی تھی جنرل (ر) پرویز مشرف کی سیاسی حکمت عملی کی۔ پرویز مشرف نے این آر او کو اپنی غلطی قرار دیکر پیپلز پارٹی کو چھیڑا، پھر یہ کہہ کر پیپلز پارٹی کو ریلیف دے دیا کہ محترمہ بینظیر اور آصف زرداری دونوں کے خلاف مقدمے اتنے کمزور یا نامکمل تھے کہ پاکستان اور سوئس عدالتوں میں ثابت نہیں ہو سکتے تھے۔ یہ مقدمات میاں نواز شریف کے دور میں سیف الرحمٰن نے بنوائے تھے۔نواز حکومت کی برطرفی کے بعد چیف جسٹس ارشاد حسن خان کی قیادت میں سپریم کورٹ کے بنچ (جس میں چیف جسٹس افتخار محمد چودھری شامل تھے) نے جو تاریخی فیصلہ دیا اس میں مبینہ کرپشن، کرپٹ پریکٹسز، گڈ گورننس قائم کرنے میں ناکامی کے الزامات کے ساتھ نواز حکومت پر ایک الزام یہ بھی تھا:۔

The process of accountability carried out by the

former Government was shady, in as much as, either it was directed against the political rivals or it was not being pursued with due diligence.

اس فیصلے کی عدالتی اور قانونی حیثیت اب بھی قائم ہے۔ میاں نواز شریف کی برطرفی کے بعد جنرل (ر) مشرف مذکورہ بالا مقدمات کو اپنی سیاسی بلیک میلنگ کیلئے استعمال کرتے رہے۔ جسٹس افتخار محمد چودھری چیف جسٹس بن گئے لیکن انہیں یہ مقدمے شاید اس لئے یاد نہیں آئے کہ اس وقت ان کی فائلوں پر ''این آر او'' کی جلد نہیں چڑھائی گئی تھی۔

این آر او جاری کر کے پرویز مشرف صاحب نے ان درجن بھر مقدمات کو قتلوں، ڈکیتیوں اور لوٹ مار کے سینکڑوں مقدمات کا حصہ بنا کر رائی کا پہاڑ بنایا پھر عدلیہ اور مشرف کی لڑائی کے دوران ضابطہ فوجداری میں ایک نئے ''عنوان مقدمہ'' کا اضافہ ہوا۔ این آر او بنام آصف زرداری۔ جس دفعہ کے تحت پاکستان کی تاریخ کا یہ بدنام ترین اور سنگین ترین مقدمہ فوجداری قانون کا حصہ بنا وہ ایک سرکاری راز ہے۔ بہر حال جرم کی تفصیل یہ ہے کہ اس دفعہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے پاکستان کے لبرل محروم طبقوں نے اپنی نجات کا ایک خواب دیکھا تھا جو پھانسیوں، قیدوں اور کوڑوں کے باوجود ہر الیکشن میں ''زندہ ہے بھٹو زندہ ہے'' کے نعرے لگا کر نمودار ہوتا رہا۔ لیاقت باغ میں محترمہ بینظیر کے قتل کے بعد اس خواب کو گڑھی خدا بخش میں دفن کر دیا گیا تھا اور آصف زرداری کو ورثے میں مل گیا۔ اصل مسئلہ این آر او نہیں، صرف یہ دکھ ہے کہ آصف زرداری ''جیسا برا آدمی'' دوتہائی سے زائد اکثریت لیکر صدر منتخب ہو گیا اور وہ بھی ایک ایسے اسلامی جمہوریہ پاکستان میں جس کا منشور دیانت اور امانت ہے، جس پر حکمرانی کا حق صرف ان طبقوں کو ہے جو حقیروں کو اپنے برابر نہیں بیٹھنے دیتے۔

1988ء سے آج تک اس شخص کی کردار کشی پر کروڑوں ڈالر لگائے گئے۔ ''بدترین'' مجرم بنا کر جیل میں ڈالا گیا لیکن وہ ''مردِ حُر'' کا خطاب حاصل کر کے باہر نکلا۔ ''پاکستان کھپے'' کا نعرہ لگا کر ہیرو بنا لیکن دوتہائی اکثریت سے صدر منتخب ہوتے ہی اس لئے ''ولن'' بن گیا کہ

پیپلز پارٹی کے مینڈیٹ کے خلاف کوئی سازش اس کی موجودگی میں کامیاب نہیں ہوسکتی۔

مقدمہ این آر او بنام آصف زرداری جنرل (ر) پرویز مشرف کی غلطی نہیں بلکہ ایک بہت بڑا کارنامہ بھی ہے۔ صدر زرداری کے خلاف مقدمات کا اصل عنوان سرکار بنام آصف زرداری تھا لیکن این آر او نے اس مقدمے کا نیا عنوان ''ضابطہ فوجداری'' بنام آصف زرداری بنا دیا۔ مقدمہ بھی ایک ہے اور ملزم بھی ایک۔ تبدیلی نام کا کمال دیکھئے کہ اب اسی ایک مقدمہ کو ملک کے مقدر سے جوڑ دیا گیا ہے۔

کچھ عرصہ پہلے تک میں این آر او کا بہت بڑا حامی تھا اور میرا خیال تھا کہ جنرل (ر) پرویز مشرف نے جاتے جاتے ہماری سیاست کے ساتھ ایک بہت بڑی نیکی کی ہے، اب ہم ایک نئے دور اور ایک نئی جمہوریت کا آغاز کر سکتے ہیں لیکن اب مجھے یوں لگتا ہے جیسے دانستہ یا نادانستہ طور پر یہ قانون جمہوریت کی تباہی کا بلیو پرنٹ تھا۔

مشرف صاحب نے اپنے انٹرویو میں کہا ہے کہ مقدمات میں کچھ نہیں تھا۔ لیکن کوئی بعید نہیں کہ آگے چل کر وہ کچھ اور کہہ دیں۔ یہ مقدمات اسی طرح زیر التوا تھے جب لندن میں میاں نواز شریف نے ''ملزموں'' کے ساتھ میثاق جمہوریت کیا اور عام انتخابات کے بعد مخلوط حکومتیں بنائیں۔ انہوں نے آج تک اپنے اس انٹرویو (باقاعدہ طور پر کتاب میں چھپے ہوئے) کی تردید نہیں کی جس میں کہا گیا تھا کہ انہیں آئی ایس آئی نے یہ مقدمات بنانے پر مجبور کیا تھا لیکن اب انہوں نے مطالبہ کیا ہے کہ صدر زرداری ملک سے لوٹی ہوئی دولت واپس لائیں اور قوم سے معافی مانگیں۔ کیا یہ مطالبہ اس وجہ سے جائز ہے کہ صدر زرداری کو ''پارڈن'' حاصل کرنے کیلئے کوئی پرویز مشرف دستیاب نہیں۔ جن سوئس اکاؤنٹس کا بار بار ذکر ہوتا ہے، وہ کن بنکوں میں ہیں اور ان کے دعویداروں کی تعداد کتنی ہے؟ کسی کے پاس کوئی دستاویز نہیں۔ لیکن سابق سینیٹر سیف الرحمٰن کی ایف آئی آرز کے مطابق چونکہ سوئس اکاؤنٹس میں لوٹی ہوئی دولت موجود ہے اس لئے واپس تو لانی پڑے گی۔ ایک ڈیڑھ سال پہلے چودھری شجاعت نے آصف زرداری کے خلاف ڈرگ سمگلنگ کا جھوٹا کیس بنوانے کا ڈرامہ مجھے اپنی زبان سے

سنایا تھا۔

قصہ مختصر مقدمے جھوٹے تھے، این آر او سچا ہے۔ پرویز مشرف کبھی جھوٹ نہیں بولتے لیکن آجکل میاں نواز شریف کیلئے جھوٹے الزامات کا پلندہ تیار کر رہے ہیں۔ چودھری شجاعت حسین ہمیشہ آدھا سچ بولتے ہیں۔ میاں نواز شریف میثاق جمہوریت سے مخلوط حکومت بنانے تک اپنے ہر سچ اور اصول پر قائم رہے اور انشاء اللہ قائم رہیں گے۔

میں نے پاکستان میں سچ کا اتنا بڑا میلہ پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ جھوٹ کہتا ہے یہ میلہ میرا رومال چرانے کرنے کیلئے لگایا گیا تھا۔ لیکن مجھے پتہ چلا ہے کہ کسی نہ کسی طریقے سے وہ طلسمی طوطا جنرل (ر) پرویز مشرف کے ہاتھ میں آ گیا ہے جو 1988ء میں آئی ایس آئی نے میاں نواز شریف کو دیا تھا۔ مجھے ڈر ہے کہ حکم ملنے پر جب یہ طوطا بولے گا، تب کیا ہو گا؟

■■■

11 اکتوبر 2010ء

میرے ایک دوست کی طرف سے صبح کا پہلا سوال یہ تھا، ''کیا تم لوگوں کو جنرل (ر) پرویز مشرف سے ڈرانا چاہتے ہو؟ میں نے جواب دیا، میں تو خود اس بات سے ڈرا ہوا ہوں کہ غصے اور انتقام کی آگ میں جلتا ہوا یہ شخص اپنا حساب چکانے کے لئے کسی بھی حد تک جا سکتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ جنرل (ر) مشرف کو غصہ کیوں اور کس پر ہے اور انتقام کس زیادتی کا لینا چاہتے ہیں؟ اُنہوں نے آئین توڑا، حکومت پر زبردستی قبضہ کیا اور ساڑھے آٹھ سال بادشاہت کے مزے لوٹے۔ میرا خیال ہے کہ اب انہیں کسی نئے فساد میں پڑنے کے بجائے، عیش و آرام کی زندگی بسر کرنی چاہیے۔ یہ دنیا بہت خوبصورت ہے اور اس کا ایک ایک منظر پاکستان جیسے مصیبتوں کے مارے ملک کی حکمرانی پر وارا جا سکتا ہے۔

میری رائے میں پرویز مشرف کا سب سے بڑا مسئلہ یا غصہ یہ ہے کہ ان کے ساتھ

دھوکہ کیا گیا۔ امریکہ اور محترمہ بینظیر نے مل کر پہلے انہیں وردی کی طاقت سے محروم کیا اور بے دست و پا کیا اور پھر ان کے معتمد ساتھیوں نے آنکھیں بدل لیں۔ این آر او چودھری شجاعت یا چودھری پرویز الٰہی کے کہنے پر آیا تھا نہ مشرف صاحب نے وردی اتارنے کی شرط اپنی مرضی سے مانی تھی۔ امریکہ اپنے مفادات کی تکمیل کے لئے محترمہ بینظیر کو اس لئے اقتدار میں لانا چاہتا تھا کہ پرویز مشرف کی افادیت ختم ہو چکی تھی۔ محترمہ نے وردی کے سلسلے میں کوئی لچک دکھانے سے صاف انکار کر دیا اور اسے قائل کیا کہ مسئلے کا اصل حل یہی ہے کہ مشرف صاحب چیف آف آرمی سٹاف کا عہدہ چھوڑ دیں اور مزید 5 سال کیلئے صدارت اپنے پاس رکھ لیں۔ امریکہ کے بین الاقوامی قانون میں حکم عدولی کی کم سے کم سزا موت ہے، اس لئے پرویز مشرف کو سر تسلیم خم کرنا پڑا۔ آجکل وہ اپنی غلطیوں کی ترتیب بدلتے رہتے ہیں۔ گزشتہ روز انہوں نے کہا کہ ان کی سب سے بڑی غلطی ''این آر او'' تھی۔ اگر غلطی اور مجبوری دو ہم معنی لفظ ہیں تو مشرف صاحب کا پچھتاوا بجا ہے۔ وہ امریکہ کے کہنے پر این آر او نافذ نہ کرتے اور محترمہ بینظیر معاہدہ توڑ کر وطن واپس نہ آتیں تو میاں نواز شریف کو راستہ نہ ملتا۔ مشرف صاحب کی اصل غلطی صرف یہ تھی کہ انہوں نے وردی (جسے وہ اپنی چمڑی کہتے تھے) کے مقابلے میں زندگی کا انتخاب کیا۔ یہ ایک دانشمندانہ فیصلہ تھا۔ انہیں یقیناً فیصلہ کرتے وقت وہ مشہور مثل یاد آ گئی ہوگی کہ ''مرا ہوا ہاتھی سوا لاکھ کا ہوتا ہے'' مری ہوئی وردی کی قدر و قیمت ہاتھی سے کہیں زیادہ ہے۔ وہ ایوب خان ہوتی ہے، یحییٰ خان اور ضیاء الحق ہوتی ہے جنہیں قبروں میں اتارنے سے پہلے آئین توڑنے، ملک توڑنے اور قائداعظم محمد علی جناح کے تصور پاکستان کو پامال کرنے اور انتہا پسندی کے چھروں اور کلہاڑیوں سے لہولہان کرنے کے انعام میں توپوں کی سلامی دی جاتی ہے۔ جنرل پرویز مشرف کو ملک چھوڑنے سے پہلے ہر قسم کا پروٹوکول ملا۔ انہیں ایک یادگار گارڈ آف آنر پیش کیا گیا۔ وہ نایاب سرخ گلابوں کے ہار پہن کر اسلام آباد سے رخصت ہوئے۔ انہی گلابوں کے گلدستے مشرف صاحب کو برطانیہ، امریکہ اور سعودی عرب میں پیش کئے گئے جو یہاں سے ان کے لئے بھیجے گئے تھے۔ خاص طور پر اس

لئے کہ سرخ گلابوں کی فصل لال مسجد کی معصوم بچیوں کے خون سے بوئی گئی تھی۔ یہ خوب پھلی پھولی، رنگ اور خوشبو میں بھی اپنی مثال آپ تھی لیکن غریب اور لاوارث زمینوں کی پیداوار تھی۔شاید اسی لئے جنرل مشرف کے جانے سے پہلے تلف کر دی گئی۔

جنرل (ر) پرویز مشرف نے بے شمار جرائم کیے۔ لال مسجد سے لیکر افغانستان کے پہاڑوں تک، قبائلی علاقوں سے لیکر بغداد کے گلی کوچوں تک ہر قتل عام میں وہ مجرم یا شریک مجرم تھے۔ وہ ہر اس شہری کے قتل میں شریک تھے جو خودکش بمباروں کا نشانہ بنا۔ امریکہ نے لاکھوں معصوم بچے، کمزور اور بے بس عورتیں، جوان اور بوڑھے شکار کئے اور جنرل مشرف امریکہ کے فرنٹ لائن اتحادی تھے۔ انہوں نے گوانتاناموبے کیلئے مجرم پکڑے اور فروخت کئے۔ افغانستان کے ساتھ ہمارے سفارتی تعلقات تھے، ملا عبدالسلام ضعیف باضابطہ طور پر یہاں پر سفیر تھے۔ہم نے انہیں پکڑ کر امریکیوں کے حوالے کیا گیا، ان امریکیوں نے ہمارے فوجیوں کے سامنے ملا ضعیف کو تشدد اور تذلیل کا نشانہ بنایا، لیکن وہ خاموش رہے۔ ادھر لال مسجد میں قتل عام ہو رہا تھا۔ ادھر لندن میں تقریباً تمام سیاستدان آل پارٹیز کانفرنس میں مصروف تھے، ایک مشترکہ اعلامیہ لکھا گیا تھا۔جس میں لال مسجد کا نام تک نہیں تھا۔ ملک کے اندر میڈیا اس واقعہ کی لائیو کوریج کر رہا تھا۔ پورا ملک گھروں میں بیٹھ کر یا سڑکوں پر اور بازاروں میں یہ خونی کھیل دیکھ رہا تھا۔لیکن اس بہادر قوم کا کوئی ایک فرد بھی لڑنے مرنے تو کیا احتجاج کرنے کیلئے بھی باہر نہیں نکلا۔ ہزاروں، لاکھوں لوگ گھروں کے اندر بیٹھ کر روتے رہے۔ بچے اپنی بے بسی پر، عورتیں اپنی نسوانی کمزوریوں پر اور مرد اپنی زنانہ مردانگی پر۔ میں لندن کی اے پی سی میں جمہوریت کے جنگجوؤں کے ساتھ تھا۔ لاہور میں یا اسلام آباد میں حتیٰ کہ اس ہوٹل میں بھی ٹھہرا ہوتا جو لال مسجد سے چند سو گز کے فاصلے پر واقع ہے تب بھی میں اس ظلم کے خلاف آواز بلند کرنے کے لئے کمرے سے باہر نہ نکلتا۔ اس دن پورے اسلام آباد اور راولپنڈی میں بڑے بڑے لیڈر، ریٹائرڈ جنرل اور حاضر سروس مجاہد موجود تھے۔ مجھے یوں لگتا ہے جیسے اس روز لال مسجد کے اردگرد کا سارا علاقہ الف لیلیٰ کا کوئی طلسماتی شہر بن گیا تھا

جس پر کسی پراسرار جادوگر نے ایسی پھونک ماری تھی کہ تمام مرد اچانک عورتیں بن گئے اور عورتیں پتھر ہو گئی تھیں اور انہیں اپنے بچوں کے رونے کی آواز بھی نہیں سنائی دی۔ لال مسجد کا سانحہ، قبائلی علاقوں میں جنگجوؤں کے ساتھ ساتھ بے گناہوں کا قتل عام، فوجی آپریشن میں اکبر بگٹی کی موت کے علاوہ کئی ایسے واقعات ہیں جن پر جنرل (ر) پرویز مشرف کو قومی مجرم کہا جاتا ہے۔ یہاں میرا ایک یہ سوال ہے کہ مجرم یہ پوری قوم ہے یا اکیلا جنرل پرویز مشرف؟ اس کے حوالے سے کچھ اور باتیں آگے چل کر لکھوں گا فی الحال میں اصل موضوع کی طرف واپس آتا ہوں۔

وردی اتارنے کے باوجود کھیل جنرل (ر) پرویز مشرف کے ہاتھ میں رہتا لیکن محترمہ بینظیر نے واپس نہ آنے کا معاہدہ توڑ کر ساری بساط ہی الٹ دی۔ انہوں نے اپنے ٹکٹ پر این آر او کی مہر لگوائی نہ امریکہ سے کوئی سفارشی رقعہ لیا۔ ان کے خلاف ملک کے اندر سب مقدمے ویسے کے ویسے موجود تھے جو اس قانون کے اجرا سے پہلے عدالتوں میں پڑے تھے۔ محترمہ نے واپسی کے اس ٹکٹ کیلئے نام نہاد سوئس اکاؤنٹس سے بھی کوئی رقم نہیں نکلوائی کیونکہ اس ٹکٹ کی قیمت کیلئے جو کرنسی درکار تھی وہ صرف ذوالفقار علی بھٹو کے ٹکسال میں تیار ہوتی ہے۔ یہ ٹکٹ کیا تھا؟ یہ بھٹو کی سیاسی وراثت کا ٹکٹ تھا اور محترمہ بینظیر نے اپنے شوہر، بچوں اور دوستوں کی التجائیں رد کر کے اسے کیوں خریدا؟ یہ تفصیل بیان کرتے وقت مجھے ایک گیت کے دو مصرعے یاد آ گئے ہیں

مل وکدا سجن مل جاوے

لے لواں میں جند ویچ کے

(اگر ساجن قیمت دیکر مل جائے تو میں اپنی جان کے عوض بھی خرید لوں)

انسانی رشتوں میں سب سے بڑا رشتہ باپ اور بیٹی کا ہوتا ہے۔ جسم اور روح کے اس رشتے میں روح اپنی زندگی بھی بیچ سکتی ہے۔ محترمہ بینظیر نے اپنی آنکھوں سے بھٹو صاحب کو بیدردی سے قتل ہوتے دیکھا۔ یہ ان کے دل کا ایسا زخم تھا جو مندمل ہو سکتا تھا نہ انہیں اس

خوفناک منظر کے تصور سے رہا کر سکتا تھا کہ بھٹو صاحب کے گلے میں پھانسی کا پھندا کیسے کسا گیا تھا۔

بینظیر صاحبہ کو ورثے میں بھٹو صاحب کی سیاست کے ساتھ نہتے عوام کی طاقت بھی ملی لیکن سفاک دشمنوں کا وہ مسلح لشکر جرار بھی ان کے تعاقب میں لگا رہا جو قدامت پسندی کا محافظ تھا۔ محترمہ نے بہت لمبی لڑائی لڑی۔ بے شمار دکھ سہے اور مصیبتیں کاٹیں۔ الیکشن جیتے، اقتدار میں آئیں لیکن انہیں قبول نہیں کیا گیا۔

جنرل (ر) پرویز مشرف کے دور میں انہوں نے جلا وطنی کاٹی، ملک کے اندر آصف زرداری نے 8 سال جیل میں گزارے لیکن مشرف کی سرپرستی میں اقتدار قبول نہیں کیا۔ زرداری صاحب رہا ہو کر ملک سے باہر چلے گئے۔ اسی دوران وہ فیصلہ کن مرحلہ آیا جب امریکہ کے پاس محترمہ بینظیر سے معاملہ طے کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا تھا۔ بینظیر صاحبہ کا ٹارگٹ وردی تھی اس لئے امریکہ کو یہ مطالبہ مشرف پر مسلط کرنا پڑا۔ مشرف کے مطابق محترمہ نے الیکشن کے بعد تک ملک سے باہر رہنے کی شرط قبول کی تھی لیکن وہ معاہدہ توڑ کر واپس آ گئیں۔ کراچی خودکش دھماکہ ایک وارننگ تھا لیکن وہاں محترمہ کا استقبال اتنا بے مثال تھا کہ پرویز مشرف کا یہ زعم بھی ٹوٹ گیا کہ ''خاموش اکثریت'' ان کے ساتھ ہے۔ وہ کراچی سے دبئی واپس گئیں۔ پرویز مشرف نے انہیں ایک بار پھر واپسی سے روکا، خطرات سے ڈرایا لیکن وہ تقدیر سے لڑنے پر تلی ہوئی تھیں۔ بینظیر صاحبہ کے بعد میاں نواز شریف کو بھی وطن واپس آنے کی اجازت دینا پڑی۔ اس لئے سارا کھیل ہی بدل گیا۔ محترمہ کی شہادت کوئی اتفاقی حادثہ یا سکیورٹی کے معاملے میں کسی نادانستہ غلطی کا نتیجہ نہیں تھا۔ ایک طرف انہوں نے امریکہ اور جنرل پرویز مشرف کے ساتھ معاہدہ توڑا تھا۔ دوسری طرف دہشت گرد انہیں اپنے لئے خطرناک سمجھتے تھے اور تیسری طرف کچھ پراسرار عناصر بھی یقیناً سرگرم ہوں گے۔ کوئی نہ کوئی چوتھا نادیدہ دشمن بھی ریز رو میں موجود ہوگا۔ چاروں طرف سے راستے بند تھے۔

محترمہ کو ہر قیمت پر قتل کرنے کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ منصوبہ مکمل تھا، قدم قدم پر موت اس

طرح تیار کھڑی تھی کہ کسی معجزے کو بھی راستہ نہیں مل سکتا تھا۔ راولپنڈی، جی ایچ کیو کا شہر ہے جہاں فوج کے خفیہ اداروں کے دفاتر بھی ہیں۔ پولیس بھی تھی، آئی جی سمیت ہر ادارہ جاگ رہا تھا۔ آرمی ہاؤس میں جنرل پرویز مشرف بذات خود موجود تھے۔ ہزاروں نہیں تو سینکڑوں کی نفری دستیاب تھی۔ مورچوں میں بیٹھ کر فائرنگ کا تبادلہ نہیں ہو رہا تھا کہ کوئی اندھی گولی لگ جاتی۔ ایک بلٹ پروف گاڑی تھی جس کے اندر محترمہ بینظیر بھٹو بیٹھی تھیں۔ ایک خودکش بمبار ٹہلتا ہوا ان کی گاڑی کے قریب پہنچ گیا۔ کیا گاڑی کے اردگرد کوئی حفاظتی حصار نہیں بنایا گیا تھا۔ میں یہ ماننے کیلئے تیار نہیں کہ خودکش حملے کا یقینی خطرہ بھی موجود ہو اور ٹارگٹ بھی سامنے ہو، اس کے باوجود ایک گاڑی کو ایسے حملے سے نہ بچایا جا سکے جس کے لئے حملہ آور نے پیدل اپنے ٹارگٹ تک پہنچنا ہو۔ مستعفی ہونے سے ایک ڈیڑھ ماہ پہلے میری جنرل پرویز مشرف سے ایک ملاقات ہوئی جس میں انہوں نے گلہ کیا تھا کہ محترمہ نے میرے ساتھ ایک معاہدہ کیا تھا، اب آصف زرداری اس پر مجھ سے بات بھی نہیں کرتے۔ زرداری صاحب ترکی کے دورے پر تھے، اتفاق سے دوسرے دن انہوں نے فون پر مجھ سے خیر خیریت پوچھی۔ میں نے انہیں مشرف کا گلہ پہنچایا تو انہوں نے کہا کہ اگلی دفعہ ملاقات ہو تو میری طرف سے یہ پیغام دے دینا کہ جس کے ساتھ تم نے معاہدے کا ذکر کیا ہے اسے تو تم لوگوں نے قتل کروا دیا ہے۔ مجھے تو کسی معاہدے کا کوئی علم تک نہیں۔

ممکن ہے کہ زرداری صاحب کے اس جملے کی حیثیت حقیقی نہیں علامتی ہو لیکن اس کے اندر موجود یہ حقیقت ضرور فرض کی جا سکتی ہے کہ مشرف صاحب محترمہ بینظیر کو بچانے میں سنجیدہ ہوتے تو انہیں اتنی آسانی سے قتل کرنا ممکن نہ تھا۔

■■■

12 اکتوبر 2010ء

لگتا ہے کہ جنرل پرویز مشرف اور ہمارے سکیورٹی اداروں کی طرح امریکیوں نے بھی محترمہ بینظیر بھٹو کے حفاظتی معاملات میں غیر معمولی دلچسپی نہیں لی۔ وجہ صاف ظاہر تھی۔ وطن واپسی کے بعد ایک طرف انہوں نے پرویز مشرف کو ہدف ملامت بنایا، دوسری طرف صاف الفاظ میں یہ بھی کہہ دیا کہ انتخابی نتائج میں پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ (ن) اسمبلیوں میں پہلے اور دوسرے نمبر پر نہ آئیں تو وہ انتخابی عمل کی شفافیت کو تسلیم نہیں کریں گی۔ امریکہ چاہتا تو محترمہ کیلئے فول پروف　اور لامحدود سیکورٹی انتظامات کر سکتا تھا۔ اندازہ لگانے کیلئے ایک واقعہ حاضر ہے۔ ''کچھ عرصہ قبل ہیلری کلنٹن لاہور کے دورے پر آئی تھیں۔ بادشاہی مسجد میں اوریا مقبول جان صاحب ان کے ساتھ پروٹوکول ڈیوٹی کر رہے تھے۔ جب ہیلری نے کھلے آسمان کے نیچے ایک تصویر بنوانے کی خواہش ظاہر کی تو اوریا صاحب نے انہیں سیکیورٹی کے تقاضوں سے خبردار کیا۔ جواب میں انہوں نے کہا کہ یہاں کی ایک ایک حرکت سیٹلائٹ سے دیکھی جا رہی ہے۔''

محترمہ بینظیر بھٹو کے قتل کے حقائق، اس میں شامل خفیہ اور ظاہری کردار، منصوبہ بندی اور اس پر عملدرآمد کی تفصیلات کبھی منظر عام پر نہیں آ سکیں گی۔ اس طرح کی وارداتوں کے نشانات اتنی صفائی سے مٹا دیئے جاتے ہیں کہ ہواؤں کو بھی اپنا سراغ نہیں لگنے دیتے۔ قتلوں کے اس سلسلے کی پہلی کڑی ذوالفقار علی بھٹو تھے۔ انہیں علانیہ طور پر قتل کیا گیا۔ شاہنواز بھٹو فرانس میں پراسرار موت مرے۔ مرتضیٰ کو کراچی شہر کی بارونق سڑک پر گھر کے قریب نشانہ بنایا گیا۔ یہ بھی پتہ نہیں چل سکا کہ گولی کہاں سے آئی۔ محترمہ بینظیر کی شہادت کی حکمت عملی بھٹو صاحب سے مختلف تھی۔ انہیں بھرے میلے میں قتل کر کے عوام کو یہ پیغام دیا گیا تھا کہ پاکستان میں عوامی طاقت اور عوامی مقبولیت کی اوقات کیا ہے؟ ذوالفقار علی بھٹو کو باضابطہ طور پر پیشگی اطلاع دی گئی تھی کہ ایٹمی پروگرام بنانے کی پاداش میں تمہیں عبرت کی مثال بنا دیا جائے گا جبکہ محترمہ کیلئے سرنگ کے دوسرے سرے پر دھوکے کا دیا نہیں بجھنے دیا گیا۔ میں بھٹوز کی کہانیاں بار بار اس لئے لکھتا رہتا ہوں کہ یہ کسی آسمانی راز کا حصہ ہیں۔ پنجابی کے بے مثل صوفی شاعر

حقیقت میں ولی تھے۔ ایسے ولی کائنات کا بھید تو نہیں پا سکتے لیکن کہیں کسی مقام سے جو ہے بھی اور نہیں بھی، انہیں کچھ اشارے ملتے رہتے تھے۔ جنہیں پڑھ کر یوں لگتا ہے کہ جیسے انہیں صدیوں بعد رونما ہونے والی بعض حقیقتوں کا علم ہو جاتا تھا۔ 4 اپریل 1979ء کو جب بھٹو صاحب کی شہادت ہوئی۔ میں کیمپ جیل لاہور میں تھا۔ رات کو ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ قیدی ایک دوسرے کے سامنے پتھر بن کر لیٹے ہوئے تھے۔ آدھی رات کے بعد اچانک یہ سناٹا ٹوٹا اور کسی قیدی نے اپنی پرسوز آواز میں ہیر وارث شاہ کے یہ چار مصرعے بار بار گانے شروع کر دیئے۔

ہند تے سندھ دی ونڈ ہو سی
تے کجھ حصہ قصور دا جاسی
پت سندھڑی دا حکمران ہو سی
تے بنا عدل اوہ ماریا جا سی

(ہند اور سندھ کی تقسیم ہوگی، قصور کا کچھ حصہ بھی چلا جائے گا، سندھڑی کا ایک بیٹا حکمران ہوگا، جو عدل کے بغیر مار دیا جائے گا)

جب کبھی مجھے بھٹو صاحب کے قتل کی رات یاد آتی ہے، یہ سوال میرے دماغ میں گھوم جاتا ہے کہ ڈھائی تین سو سال پہلے وارث شاہ کو کیسے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ برصغیر تقسیم ہوگا اور سندھڑی کا ایک بیٹا حکمران بنے گا اور قتل ہو جائے گا۔ ہم نے وارث شاہ کی ہیر کو عشق کی کہانی سمجھ کر ہزاروں لاکھوں بار پڑھا لیکن شاعری سمجھ کر معرفت کی کچھ باتوں کی تہہ تک نہیں پہنچ سکے۔

آج ہمیں جن تباہیوں اور بربادیوں کا سامنا ہے انہوں نے پہلے چار جولائی 1977ء اور پھر 3 اور 4 اپریل 1979ء کی درمیانی رات کے دوران جنم لیا تھا۔ جنرل ضیاالحق ہوں یا جنرل پرویز مشرف، میں دونوں میں سے کسی ایک کو ''قومی مجرم'' نہیں مانتا۔ ہماری پوری کی پوری قوم اس سرزمین کی مجرم ہے۔ وہ حق اور ناحق میں امتیاز کرنے کے بجائے انہیں ایک ہی

پرات میں گوندھتی ہے۔ دکھوں اور مصیبتوں کے خلاف جنگوں کے دوران ہم دشمنوں کے بجائے آپس میں جنگیں لڑتے ہیں اور ایک دوسرے کو قتل کر کے ثواب کماتے ہیں۔ ہمیں ایک خدا، ایک رسول اور ایک قرآن ملا تھا لیکن ہم نے آسمانوں سے اترے ہوئے لفظوں کی انسانی تشریح کیلئے صوابدیدی علوم ایجاد کئے، مختلف عقیدے، مسلک اور فرقے بنائے اور اپنی اجتماعی شناخت ملیامیٹ کر دی۔

جنرل (ر) ضیاء الحق نے اس دھرتی پر جنم لینے والے سب سے قیمتی انسان ذوالفقار علی بھٹو کو قتل کر دیا۔ وہ اس ملک کی تقدیر بدل سکتا تھا اور معجزے دکھانے کی ہمت اور اہلیت رکھتا تھا۔ افغانستان کی پہلی جنگ کا نام جہاد تھا۔ جو امریکی اسلحے اور دولت سے لڑی گئی۔ اس مہم جوئی نے جہادیوں کی ایک نسل کو پروان چڑھایا جو ایک طرف چین میں سنکیانگ پر چڑھ دوڑی تو دوسری طرف امریکہ جیسے خونخوار شیطان پر حملہ آور ہو گئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جنرل ضیاالحق کے جہادیوں کو جنرل پرویز مشرف نے دہشت گرد کا خطاب دیا اور امریکہ کے فرنٹ لائن اتحادی بن گئے۔

9/11 کے وقوعہ کے متعلق فیصلہ کرنے کے بعد انہوں نے مشورے کیلئے سینئر صحافیوں کا ایک اجلاس بلایا۔ اس مشورے کا آغاز کچھ اس طرح ہوا کہ جنرل پرویز مشرف نے کہا ہم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ امریکہ کا ساتھ دیں گے۔ مجید نظامی صاحب ان کے پہلو میں ایک صوفے پر بیٹھے تھے۔ ان سے رہا نہیں گیا۔ وہ بولے کہ آپ نے فیصلہ ہی کر لیا ہے تو ہمیں کس لئے بلوایا ہے۔ جواب میں مشرف صاحب نے کچھ تلخ جملے بولے۔ جواب الجواب میں نظامی صاحب نے بھی کوئی لحاظ نہیں کیا۔ یہ ملاقات انتہائی کشیدہ ماحول میں ختم ہوئی اور جہاں تک مجھے یاد ہے اس کے بعد نظامی صاحب کبھی پرویز مشرف سے ملنے نہیں گئے۔

مشرف صاحب نے امریکہ کے وہ مطالبات بھی مان لئے جن کے بارے میں خود امریکیوں کو یقین نہیں تھا کہ منظور کر لئے جائیں گے۔ ہماری موجودہ تباہیوں اور بربادیوں کا اصل سبب یہ جنگ ہے۔ انتہا پسند ہمارے فوجیوں، شہریوں اور سیکیورٹی کے اداروں پر اس لئے

حملے کرتے ہیں کہ ان کے خیال میں ہم امریکہ کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ امریکہ ہمیں اس لئے معاشی بحران میں مبتلا رکھتا ہے کہ عوام کو سکھ کا سانس ملا تو وہ امریکہ کی غلامی سے نجات حاصل کر لیں گے۔ جنرل ضیاالحق کے زمانے میں پاکستان امریکہ کا ''غنڈہ'' تھا اور اکڑ کر بھتہ وصول کرتا تھا۔ جنرل پرویز مشرف نے پاکستان کو امریکہ کی ایک ایسی لونڈی بنا دیا جس کی اجرت کا ستر اسی فیصد حصہ نائیکہ اور اس کے کارندے اپنی خدمات کا کمشن سمجھ کر اپنے پاس رکھ لیتے ہیں۔

جب ہم امریکہ کے حکم پر پرائی جنگ میں کرائے کے سپاہی بنے، اس وقت ہم دنیا کی ساتویں ایٹمی طاقت تھے۔ اب جب ہمیں دیوالیہ معیشت اور سیلاب کی تباہ کاریوں کا سامنا ہے اور ہم فرنٹ لائن اتحادی کے فرائض بھی پورے کر رہے ہیں، رچرڈ ہالبروک فرماتے ہیں کہ وہ ہمارے سیلاب زدگان کو مکمل ریلیف نہیں دے سکتے۔ ہم ڈرون حملوں سمیت تمام امریکی زیادتیوں کو اس لئے نظرانداز کر دیتے ہیں کہ ہم ایٹمی طاقت ہیں۔

جس زمانے میں پاکستان کے ایٹمی پروگرام کے بہت چرچے تھے، ایک امریکی سفارت کار نے کچھ اس قسم کا جملہ کسا تھا کہ ''فکر کی کوئی بات نہیں، انہیں 5 ایٹم بم تو اپنے چار صوبوں اور آزاد کشمیر کے لئے چاہئیں''۔

ہم ''ایٹمی طاقت'' ہیں یا ''ایٹمی المیہ''۔

جنرل (ر) پرویز مشرف دانشمند آدمی تھے۔ اس لئے انہوں نے ملکی مفاد میں تیسری آپشن ڈھونڈ نکالی۔ ہم ایٹمی لونڈی بن گئے۔

■■■

14 اکتوبر 2010ء

پاکستان کیلئے ''ایٹمی لونڈی'' کا لفظ لکھتے ہوئے میرا دل بہت دکھتا ہے اس کے باوجود میں اکیلے جنرل پرویز مشرف کو قومی مجرم کہنے کے بجائے اپنے سمیت پوری قوم کو مجرم سمجھتا ہوں۔ میں نے پچھلے کالم میں 9/11 کے بعد اہم اخبار نویسوں اور جنرل پرویز مشرف کی جس ملاقات کا ذکر کیا تھا اس میں جنرل مشرف سے تلخ جملوں کے تبادلے کے بعد مجید نظامی صاحب نے اپنے برہم چہرے کا زاویہ بدل لیا مزید گفتگو میں حصہ لیا نہ ان کی مغرور شکل پر نظر ڈالی۔ وقت گزارنے کیلئے محفل میں باقی سب حضرات بے دلی سے مختلف سوالات کرتے رہے ہر جواب کا خلاصہ یہ تھا ''سب سے پہلے پاکستان'' جنرل مشرف کی قیادت میں دنیا کی ساتویں بڑی ایٹمی طاقت نے اپنا بانکپن لٹوایا اور آئینہ توڑ دیا۔ پھر قومی مفاد میں امریکی ایف بی آئی کو کبھی ڈاکٹروں، انجینئروں اور کبھی پروفیسروں کے گھروں میں گھسنے کی کھلی چھٹی ملی۔ ہماری پولیس سمیت قانون نافذ کرنے والے مختلف اداروں کے افسروں نے کندھوں پر ''پرنے'' رکھ لئے۔ ہم نے ریپ کو شرعی نکاح مانا۔ موت کے میلے لگے، بند کنٹینروں میں انسانی ''مجرے'' کرائے گئے۔ اس سارے کھیل میں جنرل پرویز مشرف نے نہ صرف ''ملک بچایا'' بلکہ تاحیات باوردی صدارت کی ضمانت حاصل کر لی۔

پاکستان کا ایٹمی پروگرام ایک غیر معمولی انسان ذوالفقار علی بھٹو کا خواب تھا جو انہوں نے شکست ڈھاکہ اور بھارتی ایٹمی دھماکوں کے بعد دیکھا اور پھر سعودی عرب کے شاہ فیصل اور لیبیا کے کرنل قذافی کے علاوہ چند دوسرے مسلمان ملکوں کے سربراہوں کو سنایا اور انہیں اپنی اس تھیوری پر قائل کیا کہ ایٹمی صلاحیت حاصل کر کے مسلمان تیسری عالمی طاقت بن سکتے ہیں۔ انہوں نے دنیا بھر سے مسلمان ایٹمی سائنس دان جمع کئے اور کہا کہ مجھے ہر قیمت پر ایٹم بم چاہیے۔ اس منصوبے کی تکمیل کیلئے ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو چنا گیا۔ وہ ہالینڈ میں اپنی آسودہ اور پرسکون زندگی چھوڑ کر وطن واپس آئے۔ ان کی ڈچ نژاد اہلیہ نے بھی اس خواب میں اپنا حصہ ڈالا اور اپنے آبائی ملک کو خیر باد کہہ دیا۔ اس خواب کی تکمیل کیلئے شاہ فیصل اور صدر قذافی

نے گنا نہ تولا۔ جہازوں کے جہاز بھرے اور پاکستان میں ڈالروں کے ڈھیر لگا دیئے۔ پوری دنیا میں پاکستانیوں نے دوگنی چوگنی قیمتوں پر مطلوبہ سازوسامان خریدا۔ ''سمگلنگ'' کے اس تاریخی آپریشن کا سب سے بڑا کمال یہ تھا کہ امریکیوں کو اس کھیل کا اس وقت پتہ چلا جب پاکستان بم بنانے کے میٹریل میں خودکفیل ہو چکا تھا۔ بھٹو نے امریکی دھمکیوں کے جواب میں قومی اسمبلی میں کھڑے ہو کر اعلان کیا تھا کہ ''ہم گھاس کھالیں گے لیکن ایٹم بم بنا کر رہیں گے''۔ امریکہ نے اس شاعرانہ مصرعے کے جواب میں صاحب ذوق ہونے کا ثبوت اس طرح دیا کہ بھٹو صاحب کو پھانسی کے تختے پر لے گیا تا کہ پھندے کا آخری جھٹکا لگتے وقت انہیں وہ مشہور مقولہ ضرور یاد آ جائے کہ ''پھانسی کے تختے پر گھاس نہیں اگتی''۔ جنرل ضیاء الحق نے امریکیوں کی خواہش کو من وعن پوری کیا۔ بھٹو کو ترسا اور تڑپا کر قتل کیا لیکن ہماری تاریخ کا یہ سفاک ترین جنرل قوم کے دل میں بسے ہوئے اس خواب کو قتل نہیں کر سکا جو ذوالفقار علی بھٹو نے دکھایا تھا۔ امریکی منصوبہ بندی باکمال اور حالات اس کے حق میں موافق تھے۔ بھٹو سے پہلے شاہ فیصل کو قتل کرایا گیا جو انہیں بچانے کیلئے آخری حد تک جا سکتے تھے۔ قذافی کے گرد آگ کا دائرہ بنا دیا۔ امریکہ میں ڈیموکریٹس کی حکومت آ چکی تھی جو ہمیشہ بھارت کے مفادات مقدم رکھتے ہیں۔ صدر جمی کارٹر ظاہری طور پر انسانی حقوق کے چیمپئن لیکن اندر سے ایک بے رحم امریکی تھے انہوں نے بھٹو کیلئے رحم کی ایک دھیمی سی اپیل کر کے رسم پوری کر لی اور بھارت کے وزیراعظم مرارجی ڈیسائی نے یہ جواز پیش کر کے رحم کی اپیل کرنے سے انکار کر دیا کہ یہ پاکستان کا داخلی معاملہ ہے۔ چین اور سعودی عرب کو پکی یقین دہانیاں کرائی گئی تھیں لیکن انہیں یقینی طور پر اس بات کا علم نہیں ہو گا کہ جنرل ضیاء الحق تو قرآن پاک کا حلف توڑنے سے بھی نہیں ڈرتے۔

28 مئی 1999ء کو میاں نواز شریف نے امریکی دباؤ رد کر کے ایٹمی دھماکے کر دیئے لیکن اس سے پہلے جنرل ضیاء الحق پاکستان کو فتنہ وفساد کے ناقابل علاج مرض میں مبتلا کر چکے تھے۔ انتہا پسندی، دہشت گردی، فرقہ پرستی، لسانی اور علاقائی جھگڑے حتٰی کہ برادری ازم نے

ملک کو اندر سے اتنے ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا تھا کہ ہمارا ایٹمی طاقت ہونا یا نہ ہونا تقریباً بے معنی ہو چکا تھا۔

ایٹمی دھماکوں کے ساتھ ہماری معیشت کا بھی دھماکہ ہو گیا۔ نواز شریف نے ڈالر اکاؤنٹس منجمد کر کے بیرون ملک پاکستانیوں کو ایٹمی مٹھائی کھلائی۔ نواز شریف صاحب کو دھماکے نہ کرنے کے عوض بھاری معاشی ریلیف کی پیشکش کی گئی لیکن میرے سمیت پوری قوم ایٹم بم کے جنون میں مبتلا تھی۔ مجیب الرحمٰن شامی صاحب نے مقبول لہر کے خلاف عقل کی کچھ باتیں لکھنے کی جرات کی لیکن ملامت بلکہ نفرت کا ٹارگٹ بنے۔ شامی صاحب کے ساتھ میرے ذاتی تعلقات ہمیشہ مثالی رہے ہیں بھٹو اور جنرل ضیاء الحق کا معاملہ زیر بحث ہو تو تلخی کا ماحول پیدا ہو جاتا ہے لیکن میں اس حوالے سے ان کا مداح ہوں کہ وہ ایک متوازن اور مثبت سوچ کے علمبردار ہیں۔ جمہوری جدال و قتال کے موجودہ ماحول میں بھی وہ ''سیاسی قبائلیوں'' کو منطقی انجام سے خبردار کرتے وقت اپنی ''ریٹنگ'' کی پروانہیں کرتے۔

میں نے ایٹمی دھماکوں کی اندھا دھند حمایت کی لیکن 9/11 کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ میرا نقطہ نظر درست نہیں تھا۔ میں نے معروضی حالات کا تجزیہ نہیں کیا کیونکہ جس زمانے میں بھٹو صاحب نے ایٹم بم بنانے کا خواب دیکھا تھا یا شاہ فیصل اور قذافی کے ساتھ مل کر یہ سوچا تھا کہ ایٹم بم بنا کر مسلمان اجتماعی طور پر ایک طاقتور بلاک بن جائیں گے وہ زمانہ 4 جولائی 1977ء کو ختم ہو گیا تھا۔ بھٹو صاحب کو ٹھکانے لگانے کے بعد جنرل ضیاء الحق نے لبرل اور روشن خیال پاکستان کو انتہا پسندی کے اندھیرے میں اتارا اور ایک ایسے سفر پر روانہ کر دیا جس کی منزل تباہی و بربادی تھی۔ ایٹم بم اپنے طور پر کچھ نہیں تھا اس نے ایک وسیع لینڈ سکیپ کا حصہ بننا تھا جس میں معاشی ترقی کو بنیادی حیثیت حاصل تھی۔ بھٹو نے صرف ایٹم بم نہیں، اس کے ساتھ ایک ایسی نئی ریاست کا خواب دیکھا تھا جو ہر شعبے میں ترقی یافتہ ملکوں کے برابر ہو، جو اتنی خود کفیل ہو کہ اپنے فیصلے خود کر سکے اور ہر ملک سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکے۔

9/11 سے پہلے ہم اس حالت کو پہنچ چکے تھے کہ غالب کے بقول
قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

''القاعدہ'' کے بارے میں مجھے بہت سی طوطا کہانیاں سننے کا اتفاق ہوا۔ جن کا خلاصہ یہ تھا اسامہ بن لادن نے دنیا کے اندر ایک ایسی جناتی تنظیم بنا لی ہے جس کا نیٹ ورک ہر ملک میں پھیلا ہوا ہے اور جس کے ماہرین کو سائنس اور ٹیکنالوجی پر عبور حاصل ہے۔ ملا عمر نے خود کو امیر المومنین قرار دیا اور بت شکن بن گئے۔ اسلامی نظام کے اس مثالی نمونہ نے پہلے ہی پوری دنیا کو خوفزدہ کر رکھا تھا کہ امریکہ کے خلاف دہشت گردی کی وارداتیں شروع ہو گئیں۔ ہر واردات کا سرا القاعدہ اور افغانستان سے جڑتا تھا پھر اس کے اندر سے پاکستانی برآمد ہو جاتے تھے۔ ہمارے نوعمر بچوں کو برین واشنگ کر کے خودکش بمبار بنایا گیا اور ہمارے پڑھے لکھے لوگ بھی اسامہ اور ملا عمر کے پیروکار بن گئے۔

نہتوں کا یہ لشکر امریکہ کو تباہ کرنا چاہتا تھا جس کا گناہ یہ تھا کہ اس نے انہیں اسلحہ اور پیسہ دے کر افغانستان میں روس کو شکست دلوائی اور پھر انہیں ''اکیلا'' (جنگ کا کوئی نیا میدان دیئے بغیر) چھوڑ کر چلا گیا۔ اسامہ بن لادن کے پاس بے انداز دولت بھی تھی، جنگجوؤں اور خودکش بمباروں کا ایک لشکر بھی تھا۔ انہوں نے دنیا کے مختلف ملکوں میں جہاد شروع کرا دیا۔ اور تو اور چین کو بھی معاف نہیں کیا۔ یہ سوچ کیا تھی اور اچھے بھلے صاحب علم لوگوں نے کیسے قبول کر لی؟ یہ ایک ایسا معمہ ہے جسے سامنے رکھ کر میرا دماغ ماؤف ہو جاتا ہے۔ اسی طرح میں کسی قیمت پر یہ ماننے کیلئے تیار نہیں کہ 9/11 جیسا مربوط اور سائنٹفک آپریشن القاعدہ کے کسی گروپ نے سوچا اور پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ یہ لوگ تو عقل اور جنون کے درمیان فرق جیسی عام فہم باتوں کو نہیں سمجھ سکتے، انہوں نے ایک کمپیوٹرائزڈ نظام کو کیسے ہائی جیک کر لیا؟۔

مجھے ملا عمر اور اسامہ بن لادن سے کوئی محبت ہے نہ نفرت، البتہ دکھ یہ ہے کہ انہوں نے ایک طرف پاکستان اور افغانستان میں لاکھوں مسلمانوں کو قتل کروا دیا اور دوسری طرف

بیرون ملک لاکھوں پاکستانیوں کو نفرت کی علامت بنا کر ان کا مستقبل تاریک کر دیا پھر انہوں نے ہمارے قبائلی علاقوں کو میدان جنگ بنا دیا اور ہمارے شہروں میں خودکش دھماکے کرنے لگے۔ ہمارے کچھ مذہبی اور سیاسی لیڈر اس قتل و غارت گری کا یہ جواز پیش کرتے ہیں کہ چونکہ امریکہ ان کے بچے مار رہا ہے اس لئے وہ ہم سے انتقام لینے میں حق بجانب ہیں۔ مسئلے کا آسان سا ایک حل یہ پیش کیا جاتا ہے کہ ہم امریکہ سے افغانستان خالی کرائیں اس کا طریقہ یہ بتایا جاتا ہے کہ ہم امریکہ سے لڑ جائیں اور اپنا تورا بورا بنوالیں۔

اس تھیوری کی بنیاد یہ ہے کہ ہم دنیا کی ساتویں ایٹمی طاقت ہیں۔ حالانکہ ہم ایک بھوکا ننگا ملک ہیں، ٹکڑوں میں بٹی ہوئی اور آپس میں برسرپیکار قوم ہیں جس کے ہاتھوں میں ایٹم بم تو موجود ہے لیکن پیٹ بھرنے کیلئے روٹی نہیں ہے۔ جس شخص نے ایٹم بم بنانے کا خواب دیکھا تھا وہ اس حقیقت سے آگاہ تھا کہ ملک کے نام کے ساتھ ایٹمی کا لفظ لگانے سے پہلے اسے ترقی اور خوشحالی کے مقررہ مقام تک پہنچانا ضروری ہوتا ہے۔ ورنہ وہ صرف ''ایٹمی'' ہوتے ہیں۔ دنیا انہیں ایٹمی طاقت نہیں مانتی۔

جنرل پرویز مشرف نے امریکہ کے تمام مطالبات فوراً مان لئے۔ تحفظات ظاہر کرنے کا تکلف بھی نہ کیا۔ وہ اور کر بھی کیا کر سکتے تھے ایک آپشن یہ تھا کہ ''ایٹمی المیہ'' بننے کا فیصلہ کر لیتے اور دوسرا وہی، جو انہوں نے خوشی خوشی قبول کر لیا۔ ہم امریکہ کی ''ایٹمی لونڈی'' بن گئے۔

ہم نے افغانوں کے ساتھ مل کر ایک جنگ جیتی۔ اس وقت روس، امریکہ کے مقابلے کی عالمی طاقت تھا۔ امریکہ میں فلمیں بنائی اور دکھائی جاتی تھیں کہ روس نے حملہ کر دیا تو امریکہ پر کیا کیا تباہی نازل ہوگی۔ ہمارے مٹھی بھر مجاہدین نے اس روس کو اتنی بدترین شکست دی کہ وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ ہم اپنے بارے میں تلخ حقائق پر غور نہیں کرتے۔ ہمارے ''ہم'' کی تفصیل یہ ہے کہ ہم بلوچ، ہم پٹھان، ہم پنجابی، ہم سندھی، ہم مہاجر، ہم راجپوت، ہم ارائیں، ہم گجر، ہم وغیرہ وغیرہ جو خود کو ایٹمی طاقت کہتے ہیں ایک دوسرے کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے، ہماری مسجدیں الگ، ہمارے جنازے الگ، ہماری سیاست الگ، ہمارے جمہوری

اصول الگ، ہماری ہر جمہوری حکومت کرپٹ کہلاتی ہے اور ہر اپوزیشن خود کو دیانتدار کہتی ہے۔ 1988ء سے 1999ء تک ہماری چاروں حکومتوں کو کرپشن کے الزامات کے تحت فارغ کیا گیا۔ میڈیا کے فتویٰ کی روشنی میں یہ پانچویں حکومت تو کرپشن کے سوا کوئی اور کام کر ہی نہیں رہی۔ مسلم لیگ (ن) اور پیپلز پارٹی کے ٹی وی فنکار، ق لیگ، متحدہ قومی موومنٹ، اے این پی اور جمعیت العلمائے اسلام ٹی وی پر آ کر اپنی اپنی دیانت اور ایک دوسرے کی کرپشن کی قوالیاں کرتے ہیں لیکن آخر میں ناظرین کو یہ تاکید کرنا نہیں بھولتے کہ جمہوری نظام قائم رہنا چاہیے۔ اس دور کی سب سے کامیاب قوالی کا عنوان این آر او ہے۔ مشرف دور میں صدر آصف زرداری اور وزیراعظم یوسف رضا گیلانی دونوں اس وقت تک قید میں رہے جب تک عدالتوں نے انہیں ضمانت پر رہا نہیں کیا۔ جاوید ہاشمی کو اپنا عدل جہانگیری یاد ہے۔ اس کے باوجود وہ پیپلز پارٹی والوں کو اس لئے واپس عدالتوں میں بھیجنا چاہتے ہیں کہ ان کے خیال میں پچھلی مرتبہ عدل کا کورس ادھورا رہ گیا تھا۔

جنرل (ر) پرویز مشرف نے 12 اکتوبر 1999ء کو اقتدار پر قبضہ کیا۔ اس وقت بھی ان کی وردی پر دیانت کے تمغے جگمگا رہے تھے۔ صدارت سے مستعفی ہونے کے بعد وہ پوری شان و شوکت کے ساتھ لندن روانہ ہوئے۔ دور اقتدار میں ان پر کرپشن کا کوئی الزام لگا نہ ہی اب تک ملک سے باہر ان کی کسی جائیداد یا بنک اکاؤنٹ کا سراغ ملا ہے۔ پارلیمنٹ کے اندر اور باہر کرپشن کرپشن کی پکار پڑی ہوئی ہے۔ حساب کتاب ہو رہا ہے کہ کس نے زیادہ لوٹا اور کون خسارے میں رہ گیا۔

جنرل ضیاء الحق کے گیارہ سالہ دور میں صرف پیپلز پارٹی نے جمہوریت کیلئے لڑائی لڑی پھانسیوں کے تختے ہوں یا قید خانے اور کوڑے لگانے کیلئے بنی ہوئی ٹکٹکیاں، اس نے ہار مانی نہ کسی مروت اور رعایت کی طلب گار ہوئی۔ ضیاء الحق کی موت کے بعد اسٹیبلشمنٹ نے اس کے ووٹ بنک پر بار بار ڈاکہ مارا۔ لیکن اس کا حوصلہ نہیں ٹوٹا۔ ضیاء الحق کے بھوت مسلسل اس کے تعاقب میں رہے۔ 12 اکتوبر 1999ء کو نیا بھوت آ گیا، جس کا نام جنرل پرویز مشرف تھا۔

16 اکتوبر 2010ء

12 اکتوبر 1999ء کو جنرل پرویز مشرف کی شکل میں پاکستان میں ایک نئی بلا نمودار ہوئی اس کا ظاہری رنگ اور سوچ دیکھ کر لبرل طبقوں کو ابتدائی طور پر یہ گمان ہوا کہ وہ اس کالی بلا کا توڑ ثابت ہوگی جو 4 جولائی 1977ء کو نازل ہوئی تھی اور گیارہ سال عوامی امنگوں کا کلیجہ چباتی رہی ، پھر غلام اسحاق اور اسلم بیگ جیسی بلاؤں کو قوم پر مسلط کر گئی۔ جنہوں نے جمہوریت کے نام پر عوام سے فراڈ کئے ، پہلے دو انتخابات کے نتائج علانیہ دھاندلی کر کے بدلے اور چوتھے عام انتخابات میں کوئی ایسا کرتب دکھایا کہ پیپلز پارٹی کو پنجاب میں صرف ایک صوبائی نشست ملی۔ آغاز میں عام لوگوں کا تاثر یہ تھا کہ جنرل پرویز مشرف ، جنرل ضیاء الحق کی انتقامی سوچ اور قدامت پسندانہ نظریات کے وارثوں کو ٹارگٹ بنائیں گے لیکن انہوں نے پورے ملک کو ہی ٹارگٹ بنا لیا۔

1988ء سے 1999ء تک پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ (ن) دو دو بار اقتدار میں آئیں اور کرپشن کے الزامات کے تحت فارغ ہوئیں۔ جھوٹ کو سچ بنانے والی گوئبلز کی تھیوری پر عمل کرتے ہوئے دونوں پارٹیوں نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ وہ سیاست اور جمہوریت کے منہ پر کالک مل رہی ہیں اور ایک جیسے انجام سے دوچار ہوں گی۔ سینیٹر سیف الرحمان نے محترمہ بینظیر اور آصف زرداری کی کرپشن کے چند افسانے لکھے تھے جو پرویز مشرف کو تحفے میں ملے۔ انہوں نے ان مقدمات کو اپنے بنائے ہوئے ادارے نیب کے حوالے کر دیا اور ”شفاف“ احتساب کا ایک عمل شروع کیا جن سیاستدانوں نے مشرف کی بیعت کر لی، وہ بے گناہ ٹھہرے اور حکومت میں شامل کر لئے گئے۔ محترمہ بینظیر ملک سے باہر تھیں۔ آصف زرداری، یوسف رضا گیلانی اور پیپلز پارٹی کے دوسرے لیڈر جیلوں میں بیٹھے تھے۔ باقی ماندہ لیڈر اور کارکن سڑکوں پر سرگرم عمل تھے۔ تمام مقدمات جو اس وقت قومی مسئلہ بنے ہوئے ہیں وہ انہیں معافی مانگ کر ختم کروا سکتے تھے لیکن وہ مشرف کے خلاف جدوجہد میں مصروف رہے۔ 2002ء کے انتخابات کے بعد پیپلز پارٹی کو یہ پیشکش بھی کی گئی کہ مخدوم امین فہیم کو وزیراعظم بنوا لو اور محترمہ اور زرداری صاحب دس سال کیلئے ملک اور سیاست چھوڑ دیں۔

انہوں نے صاف انکار کر دیا، مقدمہ این آر او بنام آصف زرداری اسی ''حرف انکار'' کا خمیازہ ہے اور پیپلز پارٹی کے گلے میں اس لئے طوق بن کر لٹکا ہوا ہے کہ جنرل پرویز مشرف کے فوجی قانون میں ''حرف اقرار'' یا ''معافی نامے'' وغیرہ کو جنیوا کنونشن جیسا تقدس حاصل تھا اور انکار ناقابل معافی تھا۔

پرویز مشرف نے پھانسیاں دیں، کوڑے لگائے نہ جیل خانے بھرے، انہوں نے صرف یہ حقیقت دکھائی کہ جمہوریت کے ساتھ سیاستدانوں کی کمٹمنٹ کی سچائی کیا ہے۔ پہلی سچائی یہ تھی کہ ایک طرف نوابزادہ نصراللہ اے آر ڈی کے زیر اہتمام تحریک کی تیاریاں کر رہے تھے، دوسری طرف شریف خاندان دس سالہ جلاوطنی کا معاہدہ کر کے سعودی عرب جانے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ اس کڑے وقت میں جاوید ہاشمی کو مسلم لیگ (ن) کی قائم مقام صدارت اس لئے دی گئی کہ وہ لڑ مر کر پارٹی کو زندہ رکھیں گے۔ ہاشمی صاحب نے لمبی قید کاٹی لیکن اس کا انعام چودھری نثار علی کو ملا۔ پیپلز پارٹی کے پیٹریاٹ ضمیر کی آواز پر فلور کراس کر گئے۔ ان کے ضمیر جگانے کیلئے آئی ایس آئی اور نیب کو زیادہ محنت نہیں کرنا پڑی۔ چودھری برادران نے میاں نواز شریف کے اقتدار کیلئے لڑائی لڑنے کے بجائے پرویز مشرف سے ہاتھ ملا لئے۔ ایم ایم اے نے سرحد اور بلوچستان کی حکومتیں بچانے کے لیے 17 ویں ترمیم کی منظوری کیلئے ووٹ دے دیئے۔ مشرف صاحب کی وردی اتروانے کا کریڈٹ، اس لئے نہیں لے سکے کہ نادانستہ یا دانستہ طور پر اس نے 17 ویں ترمیم میں وردی نہ اتارنے کا ایک ''آئینی راستہ'' کھلا چھوڑ دیا تھا۔ ایم ایم اے کے ارکان اسمبلی کی اسناد کا مقدمہ سپریم کورٹ میں اسمبلیوں کی مدت ختم ہونے تک سماعت کا منتظر رہا۔ جب کبھی ایم ایم اے آنکھیں دکھانے کی کوشش کرتی تھی، اس مقدمہ کی تاریخ نکل آتی تھی اور پھر اسے اگلی پیشی تک ملتوی کر دیا جاتا تھا۔ عمران خان کو صرف ایک سیٹ جیت کر وزیراعظم بننے کا جھانسہ دیا گیا اور وہ مزاحیہ ریفرنڈم میں کھل کر مشرف کی حمایت میں نکل پڑے۔ متحدہ قومی موومنٹ پرویز مشرف حکومت کی اتحادی تھی۔ حقیقت پسند ججوں نے پی سی او کے تحت حلف لیا۔ انکار کرنے والے چپ چاپ گھر چلے

گئے۔ وہ اس وقت ہیرو بنے، نہ بعد میں۔ ان کے اس کارنامے کو اب بھی سرسری سے ذکر سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں دی جاتی۔

جنرل پرویز مشرف نے آئین توڑا۔ آرٹیکل 6 کے تحت غداری کا ارتکاب کیا۔ صرف یہی نہیں وہ قتل جیسے درجنوں سنگین جرائم میں ملوث ہیں۔ وہ غاصب اور غیر قانونی حکمران تھے لیکن کیا کوئی سیاستدان یہ کہہ سکتا ہے کہ اس نے مشرف کی قانونی حیثیت تسلیم کر کے ان سے کوئی رعایت یا مروت نہیں مانگی یا ان کا ساتھ نہیں دیا۔ این آر او کسی بہت بڑی رعایت کا نام ہے تو وہ کون سی سیاسی جماعت ہے جس نے پرویز مشرف سے کوئی جنگ جیتی اور ہتھیار ڈالے بغیر کسی نوعیت کی ''امان'' حاصل کی۔

جمہوریت کی یہ لڑائی بھی حقیقت میں صرف پیپلز پارٹی نے لڑی۔ البتہ اس کی حکمت عملی جنرل ضیاء الحق کے ساتھ ہونے والی لڑائی سے مختلف تھی۔ آصف زرداری اور پیپلز پارٹی کی دوسری قیادت جیلوں اور ملک کے اندر بیٹھ کر جنرل پرویز مشرف کے خلاف مزاحمت کرتی رہی۔ محترمہ بینظیر نے غیر ملکی محاذ پر سیاسی کھیل کھیلا کیونکہ انہیں اس حقیقت کا ادراک تھا کہ نہتے عوام کو سڑکوں پر لا کر فوجی حکومتوں کو نہیں ہٹایا جا سکتا۔ محترمہ کا ٹارگٹ پرویز مشرف کی وردی تھی۔ انہوں نے یہ مطالبہ منوا لیا۔ دو ہفتے قبل میرے پروگرام کالم کار میں سابق وفاقی وزیر اطلاعات محمد علی درانی نے جو کابینہ کے مذکورہ اجلاس میں موجود تھے، اس کہانی کی تصدیق کی اور جب میں نے یہ پوچھا کہ ''انہوں نے'' کا مطلب کیا تھا تو درانی صاحب نے کہا ''امریکہ''۔

پیپلز پارٹی قیادت کے خلاف مقدمات کی تعداد زیادہ سے زیادہ سترہ اٹھارہ تھی لیکن متحدہ قومی موومنٹ والوں نے کہا کہ ان کے لیڈروں اور کارکنوں کے خلاف مقدمات بھی سیاسی تھے۔ اس لئے انہیں بھی پیکیج میں شامل کیا جائے۔ یہ مطالبہ مان لینے کے نتیجے میں این آر او ڈکیتی، چوری، قتل، رہزنی اور لوٹ مار کے سینکڑوں مقدمات کا عنوان بن گیا۔ سپریم کورٹ نے اس سیاہ ترین قانون کو منسوخ کر دیا۔ این آر او کیس میں پٹیشنز اور استدعا کے

دائرے سے باہر نکل کر صدر زرداری سمیت مختلف پارٹی لیڈروں کو ٹارگٹ بنایا گیا اور ملزموں کو فریق بنائے یا ان کا موقف سنے بغیر وہ فیصلہ سنا دیا جس نے قومی تنازعے کی شکل اختیار کر رکھی ہے۔

تقریباً ہر سیاسی پارٹی نے پرویز مشرف سے کچھ نہ کچھ (ذاتی یا اجتماعی ریلیف کی شکل میں) مانگا اور حاصل بھی کیا۔ محترمہ بینظیر نے کوئی معاہدہ کیا۔ نہ معافی نامہ لکھا۔ امریکیوں کے ذریعے وردی اتروانے کے عوض کچھ زبانی وعدے کیے۔ لیکن عام انتخابات سے پہلے وطن واپس نہ آنے اور صدر مشرف کے ساتھ شریک اقتدار ہونے کا وعدہ توڑ کر نہ صرف مشرف کا اصل منصوبہ درہم برہم کر دیا تھا بلکہ امریکہ کی دشمنی بھی مول لے لی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب این آر او کا جمبو سائز گفٹ پیک کھولا گیا تو اس کے اندر سے دس سال پرانے مقدمات کی فائلوں کے درمیان محترمہ بینظیر کا تابوت بھی پڑا ہوا تھا۔ یہ تابوت گڑھی خدا بخش کی طرف روانہ کر دیا گیا۔ مقدمات کی فائلیں سپریم کورٹ نے اپنے پاس منگوا لیں۔

این آر او کی کہانی کا عنوان کیا ہے ''ایک خوبصورت لاش پر بدشکل قاتلوں کا بھنگڑا''۔

■■■

20 اکتوبر 2010ء

ایوب خان، یحییٰ خان اور ضیاء الحق کی نسبت جنرل (ر) پرویز مشرف بہت بڑے ''فنکار'' تھے۔ ایوب اور یحییٰ ریٹائرمنٹ کی تنہائی میں گم ہو گئے۔ جنرل ضیاء الحق فضائی حادثے میں جاں بحق ہوئے تاہم اسٹیبلشمنٹ اور سیاست میں ان کی سوچ کا تسلسل نہیں ٹوٹا۔ انٹیلی جنس ایجنسیوں نے مداخلت کر کے پیپلز پارٹی کو ابتدائی دو انتخابات میں پہلے محدود کیا اور پھر ہرا دیا۔ تیسرے انتخابات میں محترمہ بینظیر زیادہ بڑے مینڈیٹ کے ساتھ اقتدار میں آئیں۔ ''اپنا'' صدر منتخب کرایا اور ''اپنا'' ہی چیف جسٹس مقرر کیا لیکن انہی ''اپنوں'' کی مہربانی کے نتیجے میں نہ صرف حکومت سے فارغ

ہوئیں بلکہ عام انتخابات میں پیپلز پارٹی کو ایک ایسی شکست سے دوچار ہونا پڑا جس کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ میاں نواز شریف دو تہائی سے بھی بڑا مینڈیٹ لیکر اقتدار میں آئے۔ پہلے ایوان صدر اور سپریم کورٹ کو فتح کیا۔ آخر میں آرمی چیف جنرل جہانگیر کرامت سے استعفیٰ لینے کا کارنامہ انجام دیا۔ جنرل پرویز مشرف کو آرمی چیف لگانے کے بعد انہوں نے خود کو ہر طرف سے محفوظ سمجھ لیا تھا لیکن آرمی چیف کو "سرکاری ملازم" سمجھ کر ہٹانے کی جس روایت کی بنیاد انہوں نے رکھی اسے فوج کا ادارہ "ہضم" نہیں کرسکتا تھا، یہی وجہ ہے کہ جب میاں نواز شریف نے پرویز مشرف کی جگہ جنرل ضیا الدین بٹ کو آرمی چیف مقرر کیا، تو جی ایچ کیو پہلے سے ہی جوابی کارروائی کیلئے تیار تھا۔ ضیاء الحق کی طرح پرویز مشرف نے بھی سپریم کورٹ سے جو خود غیر آئینی ہو چکی تھی، آئینی تحفظ لیا۔ انہوں نے تین سال بعد عام انتخابات کروائے اور پارلیمنٹ سے 17 ویں ترمیم منظور کروا لی۔ 3 نومبر کو نئی پی سی او عدلیہ قائم کرنے کے واحد اقدام کے سوا مشرف نے جو کچھ بھی کیا، اسے آئین کی پناہ حاصل ہے۔ موجودہ حکومتی، عدالتی، عسکری اور انتظامی سیٹ اپ 3 نومبر 2007ء کے پی سی او کی کوکھ سے نکلا تھا لیکن اس معاملے میں جائز یا ناجائز کی بحث اس لئے بے معنی ہے کہ ہمارے ملک میں لفظوں کے مفہوم وقت کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔

جنرل پرویز مشرف نے وردی اتاری، عام انتخابات کروائے جن میں اُن کی مخالف سیاسی جماعتیں فیصلہ کن اکثریت کے ساتھ جیتیں۔ مسلم لیگ (ق) ہار کر ٹکڑوں میں بٹ گئی۔ پیپلز پارٹی کی حکومت بنی، وزیر اعظم گیلانی اور ان کی مخلوط کابینہ کے ارکان نے مشرف کو آئینی صدر مان کر حلف اٹھایا، وہ چین کے دورے پر گئے جس میں وزیر خارجہ شاہ محمود قریشی اور وزیر دفاع احمد مختار ان کے ساتھ تھے۔ مواخذے کی نوبت آنے سے قبل مشرف صدارت سے مستعفی ہو گئے۔ بعد کے عرصے میں بھی وہ آرمی ہاؤس میں مقیم رہے۔ اندورن ملک دورے کیئے اور وہی سیکیورٹی اور پروٹوکول لیا جو صدر کے طور پر انہیں ملتا تھا۔ تینوں مسلح افواج نے انہیں ایک یادگار گارڈ آف آنر دیا۔ آصف زرداری نئے صدر منتخب ہوئے۔ 3 نومبر کی عدلیہ بھی

بحال ہوئی۔ قصہ مختصر پاکستان چھوڑنے کی تاریخ مقرر کرنے سے پہلے پرویز مشرف نے یہ ثابت کیا کہ انہیں کسی سے کوئی خوف نہیں۔ آرٹیکل 6 کے تحت مقدمے چلانے کے مطالبے کا جوش انہوں نے سعودی عرب کا شاہی مہمان بن کر ٹھنڈا کر دیا۔

اس کھیل کا دوسرا حصہ برطانیہ میں اس آل پاکستان مسلم لیگ کا قیام ہے جس کی رکنیت مشرف صاحب نے قبول کی ہے۔ پریس کانفرنسوں اور تقریروں میں ان کا عمومی ٹارگٹ میاں نواز شریف ہیں۔ پرویز مشرف اپنے دور اقتدار کی کچھ غلطیاں تسلیم کرتے ہیں، لیکن ساتھ یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ فیصلے ٹھیک تھے لیکن ٹائمنگ غلط ہوگئی تھی یا نتائج اندازے کے برعکس نکلے۔ صدر آصف زرداری اور حکومت کے معاملے میں ان کا رویہ شاید اس لئے نرم ہے کہ جاتے جاتے پیپلز پارٹی کے ساتھ حساب برابر کر گئے تھے۔ کچھ باقی رہ گیا تھا تو احتیاطاً وہ پیپلز پارٹی کیلئے این آر او کا پھندا لگا گئے تھے۔

جنرل (ر) پرویز نے ایک چھوٹے سے گروپ کے ساتھ اپنی سیاست کا آغاز کیا ہے۔ اگلے مرحلے میں یہ گروپ وائٹ یا بلیک پیپروں کی اشاعت کا ایک سلسلہ شروع کرنے والا ہے جس میں جمہوریت کے علمبرداروں کے بارے میں کچھ ایسی ''حقیقتیں'' پیش کی جائیں گی کہ عام لوگ دنگ رہ جائیں گے۔

ضیاء آمریت کے خلاف جمہوریت کی پہلی جنگ پیپلز پارٹی نے مسلسل گیارہ سال لڑی۔ ذوالفقار علی بھٹو اور ہزاروں کارکنوں نے اپنا خون بہایا۔ جیلیں کاٹیں، کوڑے کھائے، خاندان کے خاندان اجڑے۔ پہلے 1988ء میں اس خون کا اصل رنگ چرایا گیا پھر سیاہی پھیر دی گئی، 1993ء میں اس خون نے دوبارہ اپنا رنگ دکھایا۔ گیارہ سال کی جدوجہد کے صلے میں اسے 40 ماہ کا ادھورا سا اقتدار ملا۔ 12 اکتوبر 1999ء کے بعد جمہوریت کی دوسری لڑائی بھی پیپلز پارٹی نے لڑی۔ اس کے درجنوں کارکنوں نے عدلیہ کی آزادی کیلئے اپنے خون سے دیئے جلائے جن کا صرف دھواں ہی ان کا مقدر بنا۔ اس لڑائی کے دوران جمہوریت کے بلڈ بنک میں پیپلز پارٹی کے بیسیوں کارکنوں کے ساتھ ساتھ محترمہ بینظیر نے بھی اپنا خون جمع

کرایا لیکن وہ اب بھی 4 جولائی 1977ء والے ان بھوتوں سے چھٹکارا نہیں پا سکی جو جنرل ضیاء، جسٹس انوار الحق اور جسٹس مولوی مشتاق حسین کی سوچ کے وارث ہیں۔

یوں لگتا ہے جیسے پیپلز پارٹی کا خون، وہ خون خاک نشیناں ہے جس کے مقدر میں رزق خاک بننے کے سوا کچھ نہیں۔

جنرل (ر) پرویز مشرف کو ہٹانے کا کریڈٹ لینے والوں کی تعداد شاید ایک درجن سے بھی زیادہ ہے، اس جن کی جان وردی کے طوطے میں تھی۔ یہ طوطا محترمہ بینظیر بھٹو نے امریکہ کے ذریعے چھین لیا۔ اگر مرے ہوئے جن کی موت کا سبب دور سے پتھر مارنے والوں کی نشانہ بازی کا کمال تھا تو اس دعوے کو بھی درست مان لینے میں کوئی ہرج نہیں، یہ پتھر لوہے کی تاروں کی ایک باڑ کو اس لئے نہیں توڑ سکے کہ چھوٹی موٹی چیزوں کو نشانہ بنانا اپنی ہتک سمجھتے تھے۔

■ ■ ■

21 اکتوبر 2010ء

سوئس اکاؤنٹس کا کوئی دستاویزی ریکارڈ دستیاب نہیں۔ وہ کہاں اور کس کے نام پر ہیں، ابھی تک دریافت نہیں ہو سکا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ایک ''طلسمی چٹ'' سے چپکے ہوئے ہیں جسے تعویز بھی کہا جا سکتا ہے۔ سابق سینیٹر سیف الرحمن نے بہت ساری قومی دولت خرچ کر کے یہ چٹ ایک ''طلسمی طوطے'' سے خریدی تھی۔ چٹ پر ایک آف شور کمپنی کا نام اور رقم کی مالیت درج تھی۔ سب سے نیچے اے، اے یا بی، بی لکھا ہوا تھا۔ اس سے آگے سراغ لگانے کا عمل جاری تھا کہ حکومت کا تختہ الٹ گیا۔ سیف الرحمن کو جیل جانا پڑا وہ دن رات روتا رہتا تھا۔ ایک دن بھری کچہری میں سوئس اکاؤنٹس والے کے پاؤں پر گر کر جھوٹا مقدمہ بنانے پر معافی مانگی۔ طلسمی طوطا اتنا شرمسار ہوا کہ جنگل کی طرف واپس بھاگ گیا۔ یہ وہی طوطا ہے جس کے متعلق میں نے لکھا تھا کہ جنرل (ر) پرویز مشرف کے ہاتھ لگ گیا ہے۔ آجکل وہ اپنے سابق مالکان کے خلاف ''مخبر اعلیٰ'' بنا پھرتا ہے

ایک اطلاع کے مطابق یہ طلسمی طوطا عنقریب بہت ساری چٹیں سامنے لانے کی تیاریاں کر رہا ہے جنہیں دیکھ کر لوگ توبہ توبہ کر اٹھیں گے۔

این آر او کے پیٹ میں موجود جس لٹی ہوئی دولت کے ساتھ پاکستان کا روشن مستقبل وابستہ ہے اس کی کل مالیت 6 کروڑ ڈالر بتائی جاتی ہے پاکستانی روپے میں یہ رقم 5ارب روپے بنتی ہے۔ پچھلے دنوں ایک ٹی وی سکرین پر اس رقم کے ساتھ جڑے ہوئے کچھ کرشمے دکھائے گئے تھے اور قوم کو بتایا گیا تھا کہ ''اس زرِ خطیر سے ان گنت سکول، کالج اور سڑکیں بن سکتی ہیں، پورے ملک میں خوشحالی کی لہر چل سکتی ہے اور ترقی کا ایک نیا دور شروع ہو سکتا ہے''۔

ایک عام اندازے کے مطابق ہمارے ملک میں ایسے دولت مندوں کی تعداد یقیناً تین لاکھ سے بھی زائد ہوگی جن کے پاس 5ارب روپے موجود ہیں۔ بعض کاروباری لوگوں کا خیال ہے کہ 5 ارب روپے سے لاہور اور کراچی میں صرف دو شاپنگ مال بنائے جا سکتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ فنشنگ اور فرنیچر وغیرہ کیلئے تھوڑا بہت بنک لون لینا پڑ جائے تاہم آمدنی اتنی زیادہ ہو گی کہ چار نسلیں یکمشت سنور جائیں گی۔ لگژری کاریں کرائے پر چلانے والی ایک فرم کے مالک کا کہنا ہے کہ یہ پراسرار پانچ ارب روپے اسے مل جائیں تو وہ پانچ سو کے قریب نئی پراڈو اور بی ایم ڈبلیو گاڑیاں خرید کر اپنے کاروبار میں نمبر ون بن سکتا ہے۔ مشرف کے ''طلسمی طوطے'' کا کہنا ہے کہ اس نے دشت چھانے دریاؤں میں ڈبکیاں لگائیں، بحرِ ظلمات میں گھوڑے دوڑائے، سوئس اکاؤنٹس والی چٹ کا راز تو نہیں پا سکا لیکن ادھر ادھر ڈھیروں ایسے راز ڈھونڈ نکالے جن کے کھلنے پر ہلچل مچ سکتی ہے۔

2002ء میں پیپلز پارٹی مخدوم امین فہیم کو مشرف کے ساتھ وزیر اعظم بننے کی اجازت دے دیتی تو اسے سوئس اکاؤنٹس سے متعلق ''طلسمی چٹ'' کا سراغ بھی مل جاتا اور حکومت میں معقول حصہ بھی۔ لیکن اس نے وردی والے کے ساتھ مل کر اقتدار لینے سے انکار کر دیا۔ سیاست میں ایسی باتیں یاد نہیں رکھی جاتیں کیونکہ وہ اتنی بے رحم ہوتی ہیں کہ اسے یہ سوچتے

ہوئے بھی خدا سے ڈر نہیں لگتا کہ پہلے محترمہ بینظیر جیسی عالمی شخصیت نے ان پانچ ارب روپوں کیلئے اپنی جان دے دی جو ایک طلسمی چٹ سے چپکے ہوئے تھے۔ اب یہ تاثر دیا جا رہا ہے جیسے صدر آصف زرداری کا بنیادی مسئلہ بھی یہی 6 کروڑ ڈالر یا پانچ ارب روپے ہیں۔ یہ ایک سفید جھوٹ ہے جس کو سیاست اور میڈیا کے قوالوں نے گا گا کر سچ بنا دیا ہے۔

اب سنیئے اصل مسئلہ کیا ہے؟

اصل مسئلہ آئین کے تقدس کا ہے جو سپریم کورٹ کی تیر اندازی کا مستقل ہدف رہا۔ آئین میں ترمیم یا تبدیلی کا اختیار صرف پارلیمنٹ کو حاصل ہے۔ وہ بھی آئین کے اندر لکھے ہوئے لفظوں کی حدود میں رہ کر۔ 1973 میں وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو نے ملک کو پہلا متفقہ آئین دیا تھا جسے جنرل ضیاء نے 4 جولائی 1977ء کو اغوا کر کے یرغمال بنا لیا۔ ایک نظریہ ضرورت جسٹس منیر کے دور میں ایجاد ہوا تھا جو صرف ایک فیصلے تک محدود تھا۔ 4 جولائی 1977ء کو جب جنرل ضیاء الحق نے ملک پر ناجائز قبضہ کیا تو انہوں نے چیف جسٹس یعقوب علی خاں کو ہٹا کر انوار الحق کی قیادت میں نئی سپریم کورٹ بنائی پھر جنرل اور ججوں کے اتحاد نے فیصلوں کے ذریعے ایک متوازی آئین لکھنا شروع کر دیا۔ انوار الحق کی سپریم کورٹ نے منتخب جمہوریت پر جنرل ضیاء کے ناجائز قبضے کو جائز قرار دیا۔ خدا جانے کس عدالتی اختیار کے تحت اس نے آئین کو پارلیمانی سے عسکری بنا ڈالا۔ اس اختیار کا عنوان ''تشریح'' رکھا گیا حالانکہ اس کا نام ''پامالی'' ہونا چاہیے تھا اس دور کی سپریم کورٹ نے ضیاء الحق کو آئین میں ترمیم کا اختیار بھی دیا۔ جنرل ضیاء 11 سال ملک کے باوردی آئینی صدر رہے۔ 99ء میں جنرل مشرف تشریف لے آئے، ان کی پی سی او عدلیہ نے ضیاء الحق جیسے اختیارات جنرل پرویز مشرف کو دے دیئے۔ پرویز مشرف نے انہی اختیارات کے تحت 3 نومبر 2007ء کو دوسری پی سی او عدلیہ قائم کر دی جس نے تیسری بار متوازی آئین لکھا۔ موجودہ آزاد عدلیہ کی بنیاد مشرف کا پہلا پی سی او تھا۔ یہ عدلیہ مشرف کے صدارتی انتخاب میں رکاوٹیں پیدا کر رہی تھی اس لئے سپریم کورٹ ہی کے گزشتہ فیصلوں کے مطابق مشرف کو دوسری بار اپنا آئینی اختیار

استعمال کرنا پڑا۔ پہلے پی سی او والے جج فارغ کر کے انہوں نے دوسرے پی سی او کے تحت جسٹس عبدالحمید ڈوگر کی سربراہی میں نئی سپریم کورٹ بنالی۔ عام انتخابات ہوئے، یوسف رضا گیلانی وزیراعظم بن گئے۔ آصف زرداری صدر منتخب ہو گئے۔ حکومت 3 نومبر والی عدلیہ کی بحالی کا مطالبہ ٹالتی رہی۔ 15 مارچ 2009ء کو میاں نواز شریف کی قیادت میں لانگ مارچ لاہور سے چل کر ابھی گوجرانوالہ ہی پہنچا تھا کہ وزیراعظم یوسف رضا گیلانی نے ایک ایگزیکٹو آرڈر کے ذریعے 3 نومبر والی عدلیہ بحال کر دی۔ آئین میں کوئی ایسی شق موجود نہیں جس کے تحت وزیراعظم کے کسی نوٹیفکیشن سے معزول جج بحال ہو سکتے ہوں۔ ''ایگزیکٹو آرڈر'' ہو یا ''بحالی'' یہ دونوں الفاظ عدلیہ کی حد تک آئین میں اجنبی ہیں تاہم صدر، وزیراعظم اور آرمی چیف نے اتفاق رائے سے عدلیہ کیلئے ایک متوازی آئین لکھ دیا۔

وزیراعظم کے ایگزیکٹو آرڈر میں یہ جملہ خاص طور پر شامل کیا گیا تھا کہ افتخار محمد چودھری چیف جسٹس عبدالحمید ڈوگر کی ریٹائرمنٹ پر 24 مارچ کو اپنے عہدے کا چارج سنبھالیں گے۔ اس آرڈر پر من وعن عمل کیا گیا۔ ماضی میں دو آرمی چیفس نے سپریم کورٹ کے ذریعے آئین میں تین اضافے شامل کروائے تھے یہ چوتھا اضافہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ ایک نیا آئینی عمل ضرور تھا۔ اس وقت اسلام آباد میں خون خرابے کا خدشہ تھا کیونکہ اس وقت ملک زندگی اور موت کے موڑ پر کھڑا تھا اس لئے جنرل اشفاق پرویز کیانی نے حکومت کو درمیان کا ایک راستہ دکھایا۔ جس پر چل کر جمہوریت کسی ممکنہ حادثے سے بچ سکتی تھی۔ یہ درست ہے کہ وزیراعظم یوسف رضا گیلانی نے ایگزیکٹو آرڈر کسی دباؤ کے تحت نہیں صرف اپنی ''مرضی'' سے جاری کیا۔ یہ بھی درست ہے کہ صدر زرداری نے، جنہیں اس فیصلے کے اندر چھپا ہوا ''سیاسی غدر'' نظر آ رہا تھا وزیراعظم اور آرمی چیف کے سامنے اپنی لاش سے گزرنے کی پیشکش، مذاکرات کی ٹیبل سے ہٹا دی۔ بہرحال یہ بھی حقیقت ہے کہ منطق کی فضا بنانے میں آرمی چیف کی دھیمے دھیمے انداز والی ڈپلومیسی کو اس معاملے میں بنیادی حیثیت حاصل تھی۔ وہ دھیمی گفتگو سے ضد اور نفرت تحلیل کرنے والی کڑوی گولی کھلانے کے فن میں ماہر ہیں۔ اس

فیصلے کے روح رواں جنرل کیانی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ گوجرانوالہ میں اعتزاز احسن کو ٹیلی فون پر فیصلے کی اطلاع دینے کا فریضہ خود انہوں نے ادا کیا۔ میرا اندازہ ہے کہ اخلاقی اور اصولی طور پر بحالی کے آرڈر میں شامل تینوں کردار اس مبینہ معاہدہ کی پاسداری اور اس پر مکمل عملدرآمد کے بھی ضامن تھے۔

15 مارچ کی رات گئے ایک خطرناک محاذ آرائی ختم ہوئی، پورے ملک نے سکھ کا سانس لیا۔ ایگزیکٹو آرڈر سے یہ معاملہ طے ہوگیا لیکن دوسری طرف چیف جسٹس آف پاکستان کے ذہن میں عدلیہ کی ''چین آف کمانڈ'' کا وہ تصور بہت پہلے سے موجود تھا جو عدلیہ کے عالمی تصور کی مکمل نفی پر مبنی تھا۔ جس نے بعد میں نئے مسائل کھڑے کر دیئے۔ عدلیہ کے تمام جج برابر ہوتے ہیں۔ چیف جسٹس کو سینئر امنگ برادرز کہا جاتا ہے۔ کوئی جج کسی دوسرے کا ماتحت نہیں ہوتا اسی طرح وکلا کی انجمنیں رجمنٹیں نہیں ہوتیں، سپریم کورٹ نے اپنا نیا سفر اس طرح شروع کیا کہ حاضر سروس ججوں کو سپریم جوڈیشل کونسل کا آئینی طریق بروئے کار لائے بغیر فارغ کر دیا۔ نوٹیفکیشن کے مطابق جسٹس افتخار محمد چودھری نے چیف جسٹس جسٹس عبدالحمید ڈوگر کی ریٹائرمنٹ کے بعد عہدہ خالی ہونے پر ہی اپنا چارج سنبھالا۔ لیکن اپنے پیشرو کو وائڈ ابنیشو (Void Ab initio) قرار دے دیا۔ آئین کی تشریح کے معاملے میں نئی روایت قائم کی۔ ایڈہاک ججوں کی مدت ملازمت میں توسیع اسی سلسلے کی ایک کڑی تھا۔ اسی طرح کیس کو بھی اپنی مثال کہا جا سکتا۔ ایک طرف سپریم کورٹ یہ قرار دے چکی ہے کہ وہ وزیراعظم کے ایگزیکٹو آرڈر کی محتاج نہیں لیکن دوسری طرف اس نے اسی آرڈر کو آئین کے آرٹیکل 7 اور آرٹیکل 190 کے ساتھ جوڑ دیا ہے۔ عدلیہ پی سی او زدہ ہو یا نوٹی فیکشن شدہ، حکومت نواز شریف کی طرح دو تہائی یافتہ ہو یا موجودہ حکومت کی طرح کمزور اور مخلوط۔ ہمارے آئینی رویوں کی وجہ سے اصل آئین کے ساتھ وہی سلوک ہوتا ہے جو ضیاء الحق اور مشرف نے کیا یا پھر سجاد علی شاہ پر مسلم لیگ (ن) نے آزمایا۔

ابتدا میں صدر آصف زرداری نے جج نکالنے یا لگانے کے سلسلے میں سپریم کورٹ کے

ہر حکم کو اس طرح مانا جیسے وہ دستخط کرنے کی مشین ہوں۔ خیر کی تمنا میں شر کے جال میں پھنسنے کی ایک مثال یہ بھی ہے کہ حکومت نے ایک دانشمند کا مشورہ مان کر این آر او کا دفاع نہیں کیا۔ لگتا ہے کہ این آر او کے انڈوں سے چوزے نکالنے کی حکمت عملی پہلے سے طے تھی۔ یہ مشورہ دینے والے کا مقصد یہ تھا کہ اصل کام کے خلاف مزاحمت نہ ہو۔ این آر او کے خلاف پٹیشنوں میں اسے امتیازی قانون قرار دینے کی استدعا کی گئی تھی۔ محاذ آرائی کا ماحول اس وقت پیدا ہوا جب مردہ این آر او کا پیٹ چاک کر کے اس میں سے صدر زرداری کے خلاف مقدمے نکالے گئے اور متاثرہ فریق کو سنے بغیر فیصلے میں بالواسطہ طور پر صدر کے استثنیٰ سے متعلق آئین کے آرٹیکل (2)248 کو غیر موثر کر دیا۔ اس فیصلے کا مندرجہ ذیل حصہ اصل تنازعے کی بنیاد ہے۔ اس مبہم حکم کا ٹارگٹ صدر مملکت تھے۔

"Therefore, it is declared that the initial requests for mutual legal assistance; securing the status of civil party and the claims lodged to the allegedly laundered money lying in foreign countries, including Switzerland, are declared never to have been withdrawn. Therefore, the federal government and other concerned authorities are ordered to take immediate steps to seek revival of the said requests, claims and status."

(2)248 بالکل واضح ہے۔ اس میں کہا گیا ہے۔ ''صدر یا گورنر کے خلاف اس کے عہدے کی میعاد کے دوران کسی عدالت میں کوئی فوجداری مقدمے قائم کئے جائیں گے نہ جاری رکھے جائیں گے''۔

این آر او کے فیصلے کا جو حصہ میں نے اوپر لکھا ہے اس پر عملدرآمد سے آئین کی دفعہ (2)24B عملی طور پر ٹوٹ جاتی ہے۔ تحریری طور پر اس دفعہ کو چھیڑا تک نہیں گیا۔ کیوں؟ کیا

فیصلہ کرنے والا جج یہ واضح نہیں کرنا چاہتا تھا کہ وہ آئین کے ایک آرٹیکل کے برعکس حکم جاری کر رہا ہے؟۔

صاف ظاہر ہے کہ سوئس حکومت کو خط لکھنا آئین کی دفعہ (2)248 کی کھلی خلاف ورزی کے زمرے میں آتا ہے اور خط لکھنے والا خود بخود آرٹیکل 6 کا ملزم بن جاتا ہے۔ یہی وہ کھیل تھا جس نے بے یقینی کا ماحول پیدا کیا۔ ہر قسم کے کاروبار معطل یا بند رہے۔ ایسا وقت بھی آیا کہ دیہاڑی دار سارا دن ٹھیکیداروں کا انتظار کر کے شام کو گھر واپس لوٹ جاتے تھے۔ جہاں ان کے بھوکے بیوی بچے اس انتظار میں جاگ رہے ہوتے ہیں کہ چند روٹیاں اور سالن ضرور کما کر لے آئیں گے۔ مجموعی حالات کی نوعیت یہ ہے کہ عام لوگ نفسیاتی مریض بن گئے ہیں۔ ٹی وی آن کرتے وقت ہر بار خدا سے خیر کی دعا مانگنا پڑتی ہے ''آج کا دن خیریت سے گزر جائے''۔ ہر ''آج کا دن'' اس طرح آتا ہے جیسے ہم ایک بے آئین، بے عدل اور بے حکومت قبائلی دور میں جی رہے ہیں۔ ''لاٹھی اور بھینس'' ہمارا کلچر ہے۔ اب میں آتا ہوں اس مسئلے کی طرف جسے سوئس کیسز کہا جاتا ہے جو محض 6 کروڑ ڈالر کا قصہ ہے اور جسے ملک کا سب سے بڑا مسئلہ بنا کر مسلسل ایک چرخا کاتا جا رہا ہے۔ آرٹیکل (2)248 '1973 کے اصل آئین کا حصہ تھا اور کبھی معطل نہیں ہوا۔ اس طرح کا آئینی استثنیٰ پوری دنیا میں ہر سربراہ مملکت کو حاصل ہے۔ 1973ء کا آئین بنانے والے اس لئے بے قصور ہیں کہ انہیں صدر کو یہ استثنیٰ دیتے وقت بالکل خیال تک نہیں آیا کہ 2008/09 میں آصف زرداری ملک کے صدر ہوں گے۔ افتخار محمد چودھری چیف جسٹس ہوں گے اور عدلیہ ''چیف آف کمانڈ'' بن جائے گی۔ آئین مارشل لاؤں اور پی سی اوز کی آماجگاہ بن جائے گا اور عدلیہ بار بار آئین توڑنے اور بھٹو جیسے بے گناہ اور قیمتی انسان کو قتل کرنے کے باوجود اصرار کرے گی کہ وہ اور اس کے فیصلوں کا ایک ایک لفظ مقدس ہے۔

کچھ ماہرین عدل کا خیال ہے کہ حکومت کو چاہیے کہ آئین کو جنرل ضیاء الحق کی قبر پر رکھ کر سوئٹزرلینڈ حکومت کو صدر زرداری کے خلاف مقدمات کھولنے کا خط لکھ دے۔ سوئس

حکومت بین الاقوامی قوانین کے تحت ایسے کسی خط پر کوئی کارروائی نہیں کر سکتی۔ وہ اپنا یہ موقف واضح الفاظ میں بیان بھی کر چکی ہے۔ پوپلے منہ سے یہ کہہ دینا تو بہت آسان ہے کہ عدالتی فیصلے کا احترام کرتے ہوئے سوئس حکومت کو خط لکھ کر یہ کہہ دینا چاہیے کہ وہ صدر زرداری کے مقدمات کھول دے۔ لیکن کیا یہ بھی لکھا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے قوانین کی پرواہ کرے نہ اس بین الاقوامی قانون کی جو کسی ریاست کو دوسری ریاست کے معاملات میں مداخلت نہیں کرنے دیتا اور جس کی موجودگی میں کوئی خودمختار ریاست کسی دوسری خودمختار ریاست کے سفیر اور سفارتی عملے کے خلاف بھی کوئی قانونی کارروائی نہیں کر سکتی، زیادہ سے زیادہ اسے ملک سے نکال سکتی ہے۔ ہم دنیا میں پہلے ہی اتنی قابل احترام اور باوقار قوم ہیں کہ کوئی عالمی روایت یا قانون توڑنے سے ہمارا کچھ نہیں بگڑے گا۔ مشورہ دانشمندانہ ہے۔ پوری دنیا میں یہ خط اپنی نوعیت کا پہلا عجوبہ ہوگا اور جس سے دنیا ایک ایسے ملک اور حکومت سے متعارف ہوگی جو اپنے سربراہ مملکت کے بارے میں ایک تیسرے ملک سے درخواست کرے گی کہ آپ اپنی ریاست کے علاوہ عالمی قوانین توڑ کر ہمارے ملک کے صدر کو اپنے ملک میں ملزم بنالیں۔ یہ الگ بات ہے کہ دنیا پہلے ہم پر ہنسے گی پھر روئے گی۔ ہنسے گی اس لئے کہ پہلی نظر میں اسے یہ خط ایک لطیفہ لگے گا اور روئے گی اس لئے کہ اس پر منکشف ہوگا کہ دنیا میں ہمارے جیسے ملک اور عزت دار قومیں بھی پائی جاتی ہیں۔ جو اپنے ایک باشندے سے جو اس ملک کا منتخب صدر بھی ہے سیاسی یا ذاتی انتقام لینے کیلئے آخری حد سے آگے بھی کوئی حد عبور کر سکتی ہیں۔

آخر میں جنرل (ر) پرویز مشرف کا مضمون بھی مکمل کرتا چلوں۔ انہوں نے ''سب سے پہلے پاکستان'' کا نعرہ لگایا تھا لیکن اپنے اصل مالکوں کو یہ بھی بتا دیا تھا کہ اس نعرے کو مقامی ضروریات کے مطابق مختصر کر دیا گیا ہے ورنہ پورا نعرہ یہ ہے ''آپ کے بعد سب سے پہلے پاکستان''۔

محترمہ نے وعدے توڑ دیئے۔ پرویز مشرف کی وردی اتر گئی جس کے نتیجے میں اصل پلان درہم برہم ہو گیا تھا پھر محترمہ نے میاں نواز شریف کو الیکشن لڑنے پر بھی راضی کیا اور اُن

کے ساتھ مل کر حکومت بنانے کے ارادے ظاہر کر دیئے۔ اس طرح یہ بات بھی کھل کر سامنے آ گئی کہ دہشت گردی کے خلاف جنگ کی آئندہ حکمت عملی امریکی کنٹرول سے باہر نکل جائے گی۔

جنرل (ر) پرویز مشرف ملکی اقتدار سے اتر گئے لیکن دنیا کی نظروں سے اس لئے نہیں اترے کہ انہوں نے اس کا اعتماد نہیں توڑا۔ وہ امریکہ سعودی عرب، برطانیہ اور یورپ کے ''ہیرو'' کیوں ہیں؟ عالمی میڈیا کس وجہ سے انہیں اپنی ''ڈارلنگ'' سمجھتا ہے؟ یہ کوئی معمہ نہیں۔ سیدھی سادھی یہ بات ہے کہ انہوں نے نیک نیتی، دیانتداری سے امریکہ اور اس کے اتحادیوں کی خدمات انجام دیں۔ وہ آج بھی کام کے آدمی ہیں۔ امریکہ نے اپنا یہ ''مہرہ'' بساط سے الگ کر لیا تھا لیکن پٹنے نہیں دیا۔ ہماری سیاسی جماعتوں کے بارے میں یقین سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ انہیں ماضی کا سبق بھول چکا ہے وہ ایک بار پھر یہ نہیں سمجھ پائیں گی کہ ایک دوسرے کو تباہ کرتے کرتے وہ ایک بار پھر اکٹھی غرق ہوں گی۔ کوئی بعید نہیں اگلے کسی سیٹ اپ میں جنرل (ر) پرویز مشرف کو پھر کوئی اہم رول مل جائے یا دینا پڑے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ کسی ایسے وقت پر واپس آ جائیں جب موجودہ سیاستدان ایک دوسرے کو کرپشن اور نااہلی کے الزامات میں دفن کر چکے ہوں اور جمہوریت عوام کے لئے رحمت نہیں ایک ایسی آفت بن جائے جس سے ہمیشہ کیلئے نجات پانے میں بھی کوئی ہرج نہ ہو۔ آزاد صحافت خصوصاً الیکٹرانک میڈیا نے پرویز مشرف کو بدترین آمر ثابت کیا۔ اقتدار اور ملک سے رخصتی کا فیصلہ ان کے سرپرستوں نے کیا لیکن کریڈٹ کے دعویداروں کی تعداد نصف درجن سے بھی زیادہ ہے۔ پرویز مشرف کی صدارت کے آخری مہینے میں میری ان کے ساتھ ایک ملاقات ہوئی تھی جس میں انہوں نے میڈیا کے غیر ذمہ دار رویے کا بھی گلہ کیا تھا۔ اس پر میں نے انہیں کہا تھا کہ یہ میڈیا کسی حکومت کو تو یقیناً نہیں چلنے دے گا شاید اس ملک کو بھی نہ چلنے دے۔ جواب میں انہوں نے کچھ نہیں کہا۔ میرا خیال ہے کہ اب ان کا گلہ دور ہو چکا ہوگا کیونکہ ہمارے میڈیا نے ان کا احسان چکانا شروع کر دیا ہے۔ ڈھائی سال کے مختصر عرصے میں چند لاکھ افراد پر مشتمل

با اثر طبقوں نے اس جمہوریت کو نفرت کی علامت بنا دیا ہے جو خون بہا کر حاصل کی گئی تھی۔ ہمارے میڈیا کو اپنی طاقت پر بہت ناز ہے اس کی رعایا 18 کروڑ افراد پر مشتمل ہے۔ وہ جمشید دستی جیسے عام لوگوں سے بے عزت ہونے کے بعد اپنی اوقات کا اندازہ نہیں کرتا۔ عام لوگ سڑکوں کے بجائے ٹی وی سکرینوں پر بندروں کے تماشے دیکھ کر تالیاں ضرور بجاتے ہیں ان سے راہنمائی حاصل نہیں کرتے۔ بہرحال ہمارے مخصوص میڈیا کو یہ کریڈٹ دینا ضروری ہے کہ اس نے رائے عامہ میں سوچ کی یہ لہر چلا دی ہے کہ موجودہ جمہوریت کے مقابلے میں مشرف کا دور زیادہ پرسکون تھا۔ گورننس گڈ تھی، مہنگائی کنٹرول میں تھی، امن و امان بھی نسبتاً ٹھیک تھا۔

پاکستان کی تقدیر کے اصل فیصلے کہیں اور ہوتے ہیں لیکن مشرف نے واپس آ کر سیاست کرنا چاہی تو کوئی بعید نہیں کہ موجودہ سیاسی ''غدر'' (جس کی ابتدا 1988ء میں ہوئی تھی، 1999ء سے 2008ء تک ایک وقفہ آیا لیکن موجودہ منتخب سیٹ اپ بننے کے بعد اب اس کا دوسرا دور جاری ہے) سے تنگ آئے ہوئے لوگ انہیں دیکھنے اور سننے کے لئے گھروں سے نکل پڑیں۔ اُن کی جلسہ گاہوں اور جلوسوں میں زندہ باد کے نعروں اور تالیوں سے آئین کے آرٹیکل 6 کی اسی تشریح کی توثیق کرتے نظر آئیں جو 18 اگست 1988ء کو جنرل ضیاء الحق کے جنازے کے دوران اسلام آباد میں کی گئی تھی۔ تشریح ایک صوابدیدی اختیار ہے جس کے تحت کسی پی سی او سے نجات دہندہ برآمد ہو جاتے ہیں اور کسی پر بھی ''وائڈ ابنیشو'' (Void Ab Initio) کی مہر لگ سکتی ہے۔

ہمارے ملک میں الزام تراشی، دشنام طرازی اور دروغ گوئی مقبول سیاسی کلچر ہے۔ پچھلے تین سالوں میں سیاستدانوں نے ایک دوسرے کو کرپٹ لٹیرے اور ڈاکو ثابت کر کے عوام کو یہ یقین دلا دیا ہے کہ ان کے تمام دکھوں کے ذمہ دار سیاستدان ہیں۔ ایسے ماحول میں انتخابات ہوئے اور جنرل (ر) پرویز مشرف کو تمام بڑے بڑے سیاستدانوں کی کرپشن کہانیوں کے پلندوں سمیت آئندہ انتخابی مہم میں حصہ لینے کی آزادی مل گئی تو وہ ہمارے سیاسی کلچر میں

نئے رنگ بھرتے دکھائی دیں گے۔ مشرف صاحب سچ میں جھوٹ ملانے اور اپنے مخالفوں کی کردار کشی اور ''شخصیت شکنی'' کے فن میں ماہر ہیں۔ انہیں ناز یبا اور بے رحم جملے بنانے میں بھی کمال حاصل ہے۔ انہیں واپس آنے دیا گیا تو خوب رونق لگے گی۔

ہمارے سیاستدان آپس میں کالک کی ہولی کھیل رہے ہیں۔ وفاقی اور صوبائی حکومتیں مل بیٹھ کر مسئلوں کے حل نکالنے کے بجائے ایک دوسرے کو ذمہ دار ٹھہرا کر اپنے آپ کو مطمئن کر لیتی ہیں۔

ہمارا میڈیا ہر روز تباہی کے راگ الاپتا ہے اور سیلاب جیسی آفت کے دوران بھی اپوزیشن کے ساتھ مل کر دنیا بھر کے ملکوں کو یہ پیغام دیتا ہے کہ ہماری حکومت بد دیانت ہے، تمہاری امداد کھا جائے گی۔

مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد وجود میں آنے والے اس پاکستان کی کہانی کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ کل کیا ہوگا؟ کل کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ بے یقینی کے اس ماحول میں منتخب حکومتیں ''ڈے ٹو ڈے'' معاملات میں پھنس کر کچھ نہیں کر سکتیں۔ آمریتیں طویل عرصہ گزارنے کے باوجود تباہی کے نئے تحفے دے کر رخصت ہو جاتی ہیں۔

منیر نیازی نے ایک مصرعے میں ہماری کہانی یوں بیان کی ہے:

''منیر اس ملک پر آسیب کا سایہ ہے یا کیا ہے؟''

■ ■ ■